مولانا ابوالکلام آزاد

مرتبہ: ڈاکٹر سید عبداللطیف

تصوراتِ قرآن

مرتبہ :

ڈاکٹر سید عبداللطیف

مکتبۂ جمال

تھرڈ فلور، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 7232731

Email: maktaba_jamal@email.com
maktabajamal@yahoo.co.uk

نام کتاب : تصورات قرآن

مصنف : مولانا ابوالکلام آزادؒ

مرتبہ : ڈاکٹر سید عبداللطیف

اہتمام : میاں غلام مرتضے

ناشر : مکتبہ جمال، لاہور

مطبع : گنج شکر پرنٹرز، لاہور

سن اشاعت : 2006ء

قیمت : -/100 روپے

مکتبہ جمال

تھرڈ فلور، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 7232731

Email: maktaba_jamal@gmail.com

maktabajamal@yahoo.co.uk

فہرست مضامین

حِصّہ دُوم

دیباچہ

تقریباً انیسویں صدی کے وسط سے علمائے اسلام نے قرآن کو دنیائے جدید کے آگے نئے انداز سے پیش کرنے کی متعدد کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ چاہے وہ تفاسیر تنقیدی تحقیق کی شکل میں ہو یا مختلف رسائل یا جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کی شکل میں اردو عربی اور انگریزی میں پایا جاتا ہے۔ اظہار خیال کے لیے خواہ کوئی زبان استعمال کی گئی ہو۔ بہر صورت ان کوششوں کا ماحصل اطمینان بخش نہیں ہے۔ عصر جدید کے ان علمانے زیادہ تر اس بات کی سعی فرمائی ہے۔ کہ قرآنی مطالب کو یورپی کلچر کے فکری سانچوں میں ڈھال کر پیش کیا جائے جس طرح سے قرن اولیٰ کے بعض مفسرین نے یونانی علوم کے عربی ترجموں سے متاثر ہو کر قرآنی مطالب کو یونانی فلسفہ وفکر کا لباس پہنانے کی کوشش کی البتہ شاذ و نادر ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں اور صرف کہیں کہیں ایسے گوشے اُبھرتے ہیں جہاں قرآنی تعلیمات اپنی حقیقی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ ان جدید علماء اور مفسرین نے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنے کی کوئی مستقل کوشش نہیں کی۔

دور جدید کے علماء کی مساعی سے متاثر ہو کر حال ہی میں قدامت پسند علمانے بھی تفہیم قرآن کے تعلق سے بلاشبہ خود کو جدید طرز فکر کے حامل ظاہر کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن صدیوں سے مسلمانوں کی مذہبی فکر پر قرون وسطیٰ کی قدامت پسندی کا جو بھاری بوجھ مسلط تھا۔ اس سے وہ چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ البتہ ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ اُمید کی ایک کرن دکھائی جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد منظر عام پر آئی جس کا

پہلا حصّہ سورۃ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ اور جس میں قرآنی عبارت کو اس کے اصلی معنی میں پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی سب سے بڑی خصوصیّت اس کا طریق اظہار ہے جو نہایت سیدھا سادا ہے نہ تو اس میں کوئی پیچیدگی پائی جاتی ہے اور نہ کسی قسم کا تصنع۔ وہ انسان کے فطری احساس وفکر اور زندگی کے روزمرہ کے تجربوں کو اپیل کرتا ہے گویا وہ خدا اور بندہ کے درمیان راست بات چیت ہے جو ایسی زبان میں ہے جسے ایک عام آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

قرآن میں وہی اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے۔ جو تمام الٰہی صحائف کا ہے۔ لیکن قرآن کا یہ طریق اظہار اپنی اہمیت کے باوجود عہد ماضی میں شاذ و نادر ہی کسی دارالعلوم یا اسلامی درسگاہ میں مطالعہ وفکر کا کوئی مستقل موضوع بن سکا۔ حالانکہ خود قرآن نے ان الفاظ میں رہنمائی فرمائی ہے۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرآنِ (۴۵۔۵۰) قرآن کو قرآنی انداز میں سمجھاؤ۔ لیکن تاریخ کے کسی دور بجز صدر اول کے اس رہنمائی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ قرآن کے ساتھ حزینہ یہ پیش آیا۔ کہ جوں ہی اس پر ایمان لانے والوں کی پہلی نسل ختم ہوئی بلکہ دوسری صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہی یونانی فلسفہ وعلوم کے ترجموں کی بدولت مسلم فکر پر یونانی فکر کا اثر غالب آنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فہم قرآن کے ابتدائی انداز کی سادگی مفقود ہوتی گئی اور اس کی جگہ منطقی دقیقہ سنجیاں راہ پانے لگیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ علمائے اسلام نے قرآن کی ایسی تفاسیر لکھنا شروع کر دیں۔ جن میں قرآن کے الفاظ کو ایسے معنی ومفہوم پہنانے لگے۔ جن کے حامل نہیں تھے۔ مولانا نے ترجمان القرآن کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں ان امور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یاد رہے کہ قرآن کسی مرتبہ منصوبہ کی پیداوار نہیں تھا بلکہ پیغمبر اسلام کی تبلیغی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت ۲۳ برس کے دوران میں تبدریج نازل ہوا تھا۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس کے پیام کو قبول کیا اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے انہی کے سمجھائے ہوئے مطالب قرآن کو فہم قرآنی کا معیار قرار دیا جانا چاہیے تھا لیکن بعد کے مفسرین نے ان کی تشریحات تعبیرات کو پس پشت ڈال دیا۔ اور قرآن میں نئے نئے معنی پیدا کرنے لگے پھر جیسے جیسے دوسری اقوام کے لوگ اپنے سابقہ عقائد کی یاد کو اپنے ذہنوں میں لیے ہوئے حلقہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ اس رجحان میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنی تعلیمات کے تعلق سے طرح طرح کے حیرت انگیز اور اُلجھنیں پیدا کرنے والے نقاط نظر فروغ پانے لگے۔ سیدھے سادھے الفاظ کا سیدھا سادھا مفہوم، رفتہ رفتہ مفقود ہونے لگا۔ اور قرآن کا استعاراتی یا تمثیلی عنصر یا تو صرف لفظی مفہوم کا حامل بن کر رہ گیا۔ یا پھر اسے ایسے معنی پہنا دیئے گئے جو قرآنی تصویر کی حقیقی روح سے یکسر مختلف تھے یہ صورت حال جیسا کہ راقم الحروف نے کسی اور جگہ لکھا ہے[1]

"کچھ تو اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ خدائے واحد اور اس صفات کے ساتھ تشبہ و تجسم کے غیر قرآنی تصورات وابستہ کر دیئے تھے اور کچھ اس کا باعث وہ متصوفانہ رجحان تھا۔ جو نئی افلاطونیت کی وجہ سے قرآنی تصوف میں داخل ہوگیا تھا اور بڑی حد تک ایک عجمی یا غیر عربی رجحان تھا جس کی سمت یہ تھی کہ قرآن کے عام فہم عبارت کے بین السطور معنی تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔"

آفت پر آفت یہ ہوئی کہ بیرونی اثرات کے تحت علوم اسلامیہ کی تاریخ کا جو مجتہدانہ دور ابھرا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد وہ بھی ختم ہوگیا اور ہوا کا رُخ دوسری طرف ہوگیا۔

[1] وہ ذہن جس کی تعبیر قرآن کرتا ہے۔ مطبوعہ اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز آغا پورہ حیدر آباد نمبر ۵، ۱۹۵۳ء

اب ردعمل کا دور شروع ہوا۔ اور زندگی اور فکر کے ہر شعبہ میں ہر چیز کے حدود مقرر کر دیئے گئے۔ اس موقع پر ان تمام تبدیلیوں اور ان کی بدولت پیدا ہونے والی طاقتوں کی تاریخ کی تفصیلات بیان کرنا بے محل ہوگا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اس وقت سے جو دور شروع ہوا تھا اس میں اس بات کی بھی اجازت نہیں ہو رہی تھی کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے کوئی نیا راستہ نکالا جائے اس دور میں قرآن کی جو تفاسیر لکھی گئیں وہ یا تو سابقہ تفاسیر کا چربہ ہوتی تھیں یا ان کی نقل۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس زمانے کی تفاسیر میں بسا اوقات قدیم تفاسیر کے کمزور بے سروپا اور بے محل پہلوؤں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس دور میں قرآن کی سادگی اور اس کے راست انداز تخاطب کی طرف شاذ و نادر ہی توجہ کی گئی اور یہ سمجھا جانے لگا۔ کہ دین کے لیے ضروری ہے کہ وہ پُراسرار ہو یہ تھا وہ تصور جس نے قبول عام کی سند حاصل کر لی اور قدامت پسند آج تک اسی تصور سے چمٹے ہوئے ہیں۔ رازی اور بیضاوی کی تفاسیر نے جو نمونے قائم کیے تھے آج تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی تصانیف خصوصاً سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جسے بلاشبہ مطالعہ قرآن کی کلید کہا جا سکتا ہے ماضی کے اس بیگم ورثہ پر ضرب لگائی ہے۔

ہر چند کہ مولانا آزاد کی زندگی کا بہترین حصہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے اگلے محاذ پر صرف ہوا جس میں قید و اسیری کے کئی مرحلے بھی آئے اس کے باوجود یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ انہوں نے ابتلا و آزمائش کی اس یورش میں بھی اپنی طبعی ذہانت و فطانت کے جوہر کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور ایسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن کی بدولت علوم اسلامیہ کے شعبہ میں انہیں ایک مسلمہ مرتبہ و وقار حاصل ہو گیا۔ قرآنی تعلیمات کے بارے میں ان کی تحقیق و کاوش نے ان پر اس حقیقی انسانیت دوستی کو منکشف کر دیا تھا۔ جو قرآن کی اصلی اساس ہے قرآن کی فیض یافتہ اس انسانیت دوستی کو انہوں نے اپنے اندر

کچھ اس طرح جذب کر لیا تھا کہ قرآنی تعلیمات اور اس کی تمام جزئیات کا مطالعہ وہ اسی کی روشنی میں کرتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم ان کے قرآنی مطالعہ کے علاوہ ان کے دوسرے مذاکرات وخطبات پر نظر ڈالتے ہیں جو انہوں نے مختلف علمی مجالس میں ارشاد فرمائے تو ہم یہ پاتے ہیں کہ ان متعدد سیاسی اور ثقافتی مسائل کے بارے میں بھی جن سے آج کی دنیا دوچار ہے وہ اسی انسانیت دوستی میں ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔

مولانا آزاد کے مطالعہ قرآنی نے متعدد پیرایہ اظہار اختیار کیے جن میں سب سے زیادہ اہم ان کا یادگار کارنامہ ان کی تصنیف ''ترجمان القرآن'' ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کی تمام جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمان القرآن اردو میں قرآن کا توضیحی ترجمہ ہے۔ جس میں متعدد حواشی اور فٹ نوٹ بھی شامل ہیں۔ اس تصنیف کی حقیقی غایت یہ ہے۔ کہ موجودہ دنیا کے آگے قرآنی زبان والفاظ کے وہی معنی اور مفہوم پیش کیے جائیں جو نزول قرآن کے وقت سمجھائے گئے تھے۔ قرآن کے اسلوب وانداز کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لیے انہوں نے ترجمان القرآن کے پہلے حصے یعنی سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں ان بنیادی تصورات سے بحث کی ہے جن کو قرآن پیش کرتا ہے اور کسی نہ کسی نہج سے جن کا ذکر پورے قرآن میں بار بار آتا ہے۔

ان کے ان مذاکرات میں جو بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس امتیاز کو واضح کیا ہے جو قرآنی تصورات اور ان کے عمل لانے کے طریقہ کار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلی چیز کو وہ دین کہتے ہیں اور دوسری چیز کو شرح یا منہاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود قرآن میں یہی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ اول الذکر یعنی دین جیسا کہ خود قرآن کا ارشاد ہے۔ خدا کے منتخب بندوں کے ذریعہ پیغمبر کہلاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کی ہر جماعت اور ہر گروہ کو دیا گیا تھا اور اسی بنا پر مولانا آزاد یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ مذہب جو آج دنیا

بدولت اس کی شکل بگاڑ دی گئی ہو۔ وہ دین جو مختلف پیغمبروں کے ذریعے بنی نوع انسانؑ کو عطا کیا گیا۔ لیکن مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جہاں تک شرع یا منہاج کا تعلق ہے۔ مختلف زمانوں کے حالات زندگی اور وقت کی ضرورت کے لحاظ سے بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں میں الگ الگ نوعیت کی حامل رہی لہٰذا قرآن کا ارشاد ہے کہ جب تک دین کے بنیادی تصور سے کسی شرع و منہاج کا تصادم نہ ہو۔ اس تنوع سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں جو چیز بنیادی اہمیت رکھتی ہے وہ دین ہے یعنی خدائے واحد کی ذات پر مضبوط ایمان جس کا اظہار عمل صالح کے ذریعے اس طرح ہو کہ اس کی بدولت وحدت انسانی قائم ہو سکے۔

مولانا آزاد بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ یہ تصور جس کی غایت بنی نوع انسان کو ایک خاندان کے رشتے میں منسلک رکھنا تھا۔ انسانی تاریخ کے دور میں خود غرض عناصر نے اسے کچھ اس طرح مسخ کر دیا کہ انسان، انسان کے درمیان طرح طرح کے اختلافات و نزاعات رونما ہو گئے اور اسی کو دین سمجھ لیا گیا۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کا پورا ایک حصہ تصور الٰہی کے موضوع کے لیے مختص کر دیا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح بشمول مذہب اسلام ہر مذہب کے پیروں نے وحدت الٰہی کے بنیادی تصور کو بگاڑ دیا ہے۔ مولانا آزاد کے افسوس تاسف کا یہی وہ پہلا تاثر ہے۔ جو ان کے استدلال کا محور ہے اور وہ تمام انسانوں سے یہ دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اصل دین الدین کی طرف لوٹ آئیں کیونکہ بنی نوع انسان کے مختلف گروہوں کے درمیان امن و سلامتی اور ہم آہنگی کا یہی ایک راستہ ہے۔

یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ مولانا آزاد کے مطالعہ اسلام کے نتائج کا پورا سلسلہ اب تک اس تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر ہے۔ جو اردو زبان سے واقف نہیں ہے۔ اگر شروع ہی سے اس بات کی بھی ساتھ ہی ساتھ کوشش کی جاتی۔ اسی وقت سے جب کہ پہلی

مرتبہ ان کا اخبار ''الہلال'' طلوع ہوا تھا کہ ان کی قرآنی تحقیقات کے نتائج کو کم از کم انگریزی زبان میں منتقل کیا جاتا۔ جسے اکثر و بیشتر ممالک کے تعلیم یافتہ لوگ جانتے ہیں۔ تو میں یہ کہنے کی جرات کرسکتا ہوں کہ ایسے اقدام کی بدولت ہر جگہ کے ارباب فکر ونظر کے لیے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تمام مذاہب کے مشترکہ عنصر کو منظر عام پر لانے اور مذہبی رواداری اور عالمی اتحاد پیدا کرنے کی راہ میں ایک طاقتور محرک بن جاتا ہے۔

اب بھی اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد کی تمام تصانیف اور تحریروں میں ترجمان القرآن ان کا سب سے بڑا اور منفرد کارنامہ ہے اور اس کا ابتدائی باب جو سورہ فاتحہ کی تفسیر کے طور پر لکھا گیا ہے۔ قرآنی مطالعہ کے لیے ایک شاہکار تعارف ہے۔ مولانا آزاد نے اس افتتاحی باب کو اتنی زبردست اہمیت دی ہے کہ اس تصور کی تشریح میں جسے سورہ فاتحہ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ پورے قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے اس حصہ میں علم وفکر کا ایک ایسا بے پناہ ذخیرہ پائیں گے۔ جو متداول تفاسیر میں کہیں اور نہیں ملے گا۔

راقم الحروف نے ایسے لوگوں کے استفادہ کی خاطر مولانا آزاد کی ایما پر سورۂ فاتحہ کی پوری تفسیر کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ جسے علیحٰدہ کتابی شکل میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جو مذہب کے اس بنیادی تصور کا سرسری طور پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک تشریحی خلاصہ ان صفحات پر پیش کیا جارہا ہے جسے اس تصور کے اہم خدوخال کے لحاظ سے مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

راقم الحروف نے اس موضوع کو اسی انداز سے انگریزی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو مولانا آزاد کا خاص انداز ہے تاکہ انہی کے انداز بیان میں ان کے نقطہ نظر کا لب لباب پڑھنے والوں کے سامنے آجائے جب ترجمان القرآن کی تیسری جلد شائع ہوجائے گی اس وقت ارباب علم وفضل کے لیے یہ ممکن ہوسکے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم المرتبت علامہ کی زبردست ذہانت و

فطانت کا پوری طرح اندازہ لگا سکیں اور ان کی خدمت کا اعتراف کر سکیں جو انہوں نے صرف اسلامی علوم ہی کی نہیں بلکہ عالم فکر و نظر کے لیے بھی انجام دی ہیں۔ بالفعل راقم الحروف کی یہ ناچیز کوشش ایک ابتدائی تعارف کا مقصد پورا کر سکتی ہے۔[۲]

ڈاکٹر محمد راحت اللہ خان ایم اے فلاسفی و پسرنگ کیوریٹر اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد کا شکر گزار ہوں کہ موصوف نے از راہ کرم اس کتاب یعنی اصل انگریزی کتاب کا اشاریہ مرتب کیا اور طباعت کے دوران اس کے پروف دیکھے۔

سیّد عبداللطیف

---

[۲] : یہ بات قابل اظہار ہے کہ مولانا آزاد نے اس دیباچہ اور اس کتاب کے متن کو ملاحظہ فرمایا اور ملاحظہ کے بعد جس طرح انہوں نے واپس فرمایا من وعن اسی طرح اس کی طباعت عمل میں آئی ہے۔

باب اوّل

قرآن کا تصوّرِ اللہ

کسی مذہب کے مطالعہ میں سب سے پہلی توجہ طلب بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے تصورِ الٰہی کی نوعیت کیا ہے کیونکہ بالآخر مذہب کا یہی پہلو زندگی کو اپنی قدر و قیمت کا معیار عطا کرتا ہے۔

تصورِ الٰہی کی تاریخ ایک بوقلمونی تاریخ رہی ہے۔ مادہ کی مماثلت میں کسی شخص کو تصورِ الٰہی کی تشکیل میں بھی تدریجی ارتقاء کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد کسی وقت بھی انسانی ذہن کا کارنامہ نہیں رہا کہ نیچے سے اوپر کی طرف اس کی نشوونما کا کھوج لگایا جائے بلکہ یہ اعتقاد فطرتِ انسانی کی خلقت میں شامل ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان نے سب سے پہلے خدا کی جو خیالی تصویر بنائی وہ اس کی یکتائی یا توحید کی تصویر تھی۔ ایک ایسی ان دیکھی اور برتر ہستی کی تصویر جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا۔ یہاں انسان اپنے چاروں طرف دیکھتا یا محسوس کر سکتا تھا اور پھر آہستہ آہستہ یہ تصویر بدلتی گئی اور اس میں ایک طرح سے انحطاط پیدا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ توحیدِ الٰہی کی جگہ اشتراک اور تعددِ الٰہ کا تصور اُبھرنے لگا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں انسان کی دینیاتی تاریخ میں ارتقا کے بجائے ارتجاع کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔
البتہ جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے ارتقاء کے نظریہ سے تحقیق و جستجو کے میدان میں گرانقدر مدد مل سکتی ہے۔

علمائے یورپ کا یہ رجحان کہ عقیدہ توحید کو تدریجی ارتقاء کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نمایاں ہوا لیکن اس خیال پر مبنی بیشتر نظریے انیسویں صدی کے نصف آخر میں مدون ہوئے اور نوامیس فطرت و بے جان اشیاء کی پرستش اجداد پرستی خرافاتی اساطیر، اجرام سماوی کی پوجا اور جادو ٹونا وغیرہ کے عقیدہ میں خدا پرستی کی ابتدا کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان مختلف نظریات نے جس خیال کو پروان چڑھایا وہ یہ تھا کہ زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح توحید الٰہی کا تصور بھی ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

لیکن بیسویں صدی کے انقلاب انگیز انکشاف نے اس خیال کو متزلزل کر کے رکھ لیا۔ جنوب مشرقی آسٹریلیا اور بحیرہ کاہل کے جزائر میں بسنے والے وحشی قبائل اور پھر شمالی امریکہ کے ان قدیم قبائل کے بارے میں جو عہد عتیق سے آج تک زندگی کے ایسے قدیم ترین طریقوں پر کاربند ہیں۔ جن کے تہذیبی دامن میں ارتقائی ترقی کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا۔ جب تحقیقی کام ہوا اور پھر مصریات کی تحقیقات اور عراق اور موہنجو داڑو کی کھدائیوں کے آثار سامنے آئے تو یہ حقیقت برملا ہوگئی کہ انسان کا توحیدی اعتقاد کسی ارتقائی سلسلہ کی کڑی نہیں ہے چنانچہ جدید سامی اثریات کے مطالعہ سے بھی اس نقطہ نظر کی تصدیق ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ تمام سامی قبائل اپنے ابتدائی دور میں ایک ان دیکھے خدا پر اعتقاد رکھتے تھے۔ پہلی جنگ عالمگیر کے بعد سرحد حجاز کی وادی عقبہ اور شمالی شام کے راس شمر میں جو آثار دریافت ہوئے۔ ان سے اس تاریخی حقیقت کو اور زیادہ استحکام حاصل ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بیسویں صدی کی علمی و تحقیق وتلاش نے اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں جو عقیدہ پیدا ہوا وہ توحید الٰہی کا عقیدہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان نے پہلی مرتبہ اس دنیا میں اپنی آنکھ کھولی تو وہ اپنی فطرت اور اس ماحول کے تحت جس میں اس نے اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا وہ ایک ہستی کے

اعتقاد پر مجبور ہو گیا۔ جو ان تمام چیزوں کی پیدا کرنے والی تھی جنہیں وہ اپنے ارد گرد دیکھ رہا تھا پھر آگے چل کر آہستہ آہستہ اس نے ان تمام صفات اور خصوصیات کو بھی اس ہستی مطلق کی ذات سے وابستہ کرنا شروع کر دیا جو اس کی صفات و خصوصیات سے مماثلت رکھتی تھیں اور اس طرح اس کے ابتدائی عقیدہ توحید میں ایک ترجیعی شکل پیدا ہونے لگی۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں آدم نے آنکھیں روشنی میں کھولی تھیں پھر آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی۔"

چنانچہ مصر، یونان، کالڈیا، ہندوستان، چین اور ایران ان سب ملکوں کی روایتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں نوع انسانی فطری ہدایت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ انجیل نے قطعی انداز میں آدم کے وجود کو ایک بہشتی وجود قرار دیا ہے۔ پھر جب اس کے قدموں میں لغزش آئی تب ہی وہ اس بہشتی زندگی سے بھی محروم کر دیا گیا روشنی کا جلوہ پہلے نمودار ہوتا ہے تاریکی بعد میں آتی ہے قرآن کا اعلان بھی یہی ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰: ۱۹)

ابتدا میں تمام انسان ایک ہی گروہ تھے یعنی الگ الگ
راہوں میں بھٹکے ہوئے نہ تھے پھر اختلاف میں پڑ گئے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (۲ : ۲۱۳)

ابتداء میں تمام انسانوں کا ایک ہی گروہ تھا۔ یعنی فطری ہدایت کی ایک ہی راہ پر تھے پھر اس کے بعد اختلافات پیدا ہو گئے۔ پس اللہ نے ایک کے بعد ایک نبی مبعوث کیے۔
وہ نیک عملی کے نتیجوں کی خوشخبری دیتے تھے بد عملی کے نتیجوں سے متنبہ کرتے تھے نیز ان کے ساتھ نوشتے نازل کیے تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے ہیں ان کا فیصلہ کر دیں۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ جہاں تک مذاہب کی اختلافی راہوں کا تعلق ہے۔ ان کا تعلق وجود الٰہی سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ اختلاف زیادہ تر صفات الٰہی کے بارے میں پائے جاتے ہیں انسانی عقل محسوسات کے دائرہ میں محدود ہے۔ عموماً اس کا تصور اس دائرے سے باہر قدم نہیں نکالتا اسی لیے عقل انسانی ذات مطلق کے تصور کا بہ آسانی احاطہ نہیں کر سکتی۔ جب کبھی وہ کسی ان دیکھی چیز کے تصور کی سعی کرے گی تو ناگزیر ہے کہ تصور میں وہی صفات آجائیں جن کا ادراک اسے خود اپنی ذات میں ہوتا ہے۔ اسی لیے صفات الٰہی کی جو تصویر اس کے ذہن میں پیدا ہوتی تھی۔ لازمی طور پر اس میں بھی اس کی ذہنی طفولیت کا رنگ پایا جاتا تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس کا ذہن ترقی کرتا گیا اسی کے مطابق اس کا تصور الٰہی بھی بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ جتنی اعلیٰ صفات اس کی ذات میں پیدا ہوتی گئیں وہ اپنے معبود کی صفات کو بھی ان کے مطابق بلند کرتا گیا اسی نقطہ نظر سے خدائی صفات کے بارے میں انسانی تصورات کی ارتقائی رفتار کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس ارتقائی سلسلہ کی تین نمایاں کڑیوں کا ذکر کیا ہے۔ جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ یعنی تجسم وتشبہ سے تنزیہ کی طرف۔ پھر تعدد واشراک سے توحید کی طرف اور قہر وجلال سے صفات رحمت وجمال کی طرف۔

یہاں سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ خدا کے متعلق انسان کا ابتدائی تصور صفات قہریہ کے تصور سے کیوں شروع ہوا۔ اس کی علت واضح ہے۔ فطرت کائنات کا تعمیری حسن تخریب کی نقاب میں پوشیدہ ہے۔ انسانی فکر اپنے عہد طفولیت میں تعمیر کا پوشیدہ حسن نہ دیکھ سکی وہ تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی۔ تعمیر کا حسن جمال دیکھنے کے لیے فہم وبصیرت کی نگاہ

☆ ۳ : طلوع اسلام کے وقت مختلف مذاہب عالم میں صفات الٰہی کے جو تصورات تھے اس موقع پر مولانا آزاد نے اپنی تصنیف میں تفصیل کے ساتھ ان پر روشنی ڈالی ہے۔ دیکھیے صفحات ۱۳۵ تا ۱۶۵ ترجمان القرآن جلد اول دوسرا ایڈیشن لاہور ۱۹۴۷ء

تخریب کی ہولناکیوں سے سہم گئی۔ تعمیر کا حسن جمال دیکھنے کے لیے فہم وبصیرت کی نگاہ مطلوب تھی جو وقت کی رفتار کے ساتھ تدریجی طور پر انسان کو حاصل ہوئی یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے جب عقل انسانی نے صفات الٰہی کی صورت آرائی کرنی چاہی تو فطرت کائنات کے سلبی مظاہرے کی دہشت سے فوراً متاثر ہوگئی اور ایجابی اور تعمیری حقیقت سے اثر پذیری میں اسے بہت دیر لگی بادلوں کی گرج بجلی کی کڑک آتش فشاں پہاڑوں کا انفجار، زمین کا زلزلہ، آسمان کی ژالہ باری، دریا کا سیلاب سمندر کا تلاطم ان تمام سلبی مظاہر نے اس میں دہشت وہیبت پیدا کی اور وہ اپنے خدا کو ایک غضب ناک خدا کی ڈراؤنی صورت میں دیکھنے لگا بادل اور بجلی کی خوف ناک گرج اور کڑک میں آتش فشاں پہاڑوں کے بہتے ہوئے لاوے میں وہ حسن ومحبوبی کے خدا کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔

خود اس کی ابتدائی معیشت کی نوعیت بھی ایسی نہ تھی جو اس کے خوف و دہشت کے جذبات کو کچل سکتی وہ اپنے آپ کو کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتا تھا اور اپنے علاوہ ہر شے اسے دشمنی اور ہلاکت پر تلی نظر آتی تھی۔ مچھروں کے جھنڈ چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ زہریلے جانور ہر طرف رینگ رہے تھے اور درندوں کے حملوں سے اسے ہر وقت مقابل رہنا پڑتا تھا۔ سر پر سورج کی تپش بے پناہ تھی اور سال بھر کے بدلتے ہوئے موسم اسے اپنی عافیت کے دشمن نظر آتے تھے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز اس کی تباہی و بربادی کے درپے ہے اس ماحول کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے خدا کا جو تصور قائم کیا وہ ایک خوف و دہشت کے خدا کا تصور تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تدریجی طور پر اس کی ذات میں اور اس کے ماحول میں بھی تبدیلی آتی گئی اور اس کے تصور میں یاس و دہشت کے پہلو بہ پہلو رحمت کا عنصر شامل ہوتا گیا، یہاں تک کہ معبودیت کے تصور میں صفات رحمت و جمال نے بھی ویسی ہی جگہ پالی جیسی صفات قہر وجلال کے لیے تھی۔ اس نئی بیداری نے قہر و ہلاکت کی

کا مظہر تھیں، یونان کا علم الاصنام اپنی لطافت تخیل کے لحاظ سے بلا شبہ اپنی خاص جگہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کی پرستش کے قدیم معبود بھی قہر وغضب کی خوف ناک قوتیں تھیں۔ ہندوستان میں آج تک رحمت و بخشش کے دیوتاؤں سے کہیں زیادہ ہلاکت وتباہی کے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔

نزول قرآن سے قبل تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جن کا ذہن انسانی متحمل ہو سکا تھا۔ یہ تھا کسی تشبیہی سہارے کے بغیر خدا کا تصور کیا جائے لیکن جہاں تک صفات الٰہی کا تعلق ہے وہ جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کی تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ یہاں تک کہ یہودی تصور بھی جس نے اصنام پرستی کی کسی شکل کو جائز نہیں رکھا تھا۔ اس قسم کے تشبیہ و تمثیل سے بے نیاز نہ رہ سکا اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فکر انسانی اس درجہ بلند نہ ہوئی تھی کہ تمثیل وتشبیہہ کا پردہ ہٹا کر صفات الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتی۔ جب مسیحؑ نے چاہا کہ رحمت الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں تو انہوں نے بھی باپ اور بیٹے کے رشتہ کی تشبیہہ سے کام لیا۔ اسی تشبیہہ کی بدولت ظاہر پرستوں نے ٹھوکر کھائی اور مسیحؑ کی دی ہوئی مثال اور مقصد کو نہ سمجھنے کے باعث ان کے پیروؤں نے خود مسیحؑ کو خدا کا بیٹا بنا دیا بلکہ خدا کا مرتبہ عطا کر دیا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا کے تصور کی راہ سے وہ تمثیل وتشبیہہ کے تمام پردے اُٹھا دیتا ہے اور خدا اور اس کی صفات کا جلوہ اس طرح سامنے آ جاتا ہے کہ اس میں تجسم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲:۱۱) اس کی مثل کوئی شے نہیں کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے) لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَیُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶-۱۰۳) انسان کی نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں لیکن وہ انسان کی نگاہ کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ کی ذات یگانہ ہے بے نیاز ہے۔ اسے کسی کی احتیاج نہیں۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ

الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ o (۱۱۲:۱:۶) اللہ کی ذات

یگانہ ہے بے نیاز ہے اسے کسی کی احتیاج نہیں نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہے۔ نزول قرآن سے قبل جلوہ حقیقت کی جھلک دیکھنے کے لیے دو راستے اختیار کیے جاتے تھے ایک ذات مطلق سے صفات کو وابستہ کرنے کا راستہ تھا اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ خدا کو تمام صفات سے پاک و بلند رکھا جائے پہلا راستہ تشبیہ کی طرف لے گیا جس کی وجہ سے عرفان حقیقت میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ دوسرا طریقہ وہ تھا۔ جس کا خاص طور سے اوپانی شدوں نے تتبع کیا یہ نیتی نیتی کا ایک منفی تصور تھا۔ بلاشبہ یہ تصور شریہہ یا نفی صفات کا ایک انتہائی جلوہ دکھاتا ہے لیکن عملاً وہ نفی کی طرف لے جاتا ہے۔ ہمیں یقین محکم کی لذت سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسا تصور زیادہ سے زیادہ ایک فلسفیانہ تخیل پیدا کر سکتا ہے لیکن زندہ اور راسخ عقیدہ نہیں بن سکتا۔ چنانچہ نفی صفات کے تصور کو اس کی منطقی انتہا یعنی تعطیل سے بچانے کے لیے ذات مطلق ''برہماں'' کو ذات ''ایشور'' میں اتارے بغیر کام نہ چل سکا۔ بہرحال قرآن سے پہلے ان دو راہوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ناگزیر تھا۔ قرآن نے افراط اور تفریط کے ان دونوں راستوں سے احتراز کیا اور اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ قرآن نے جو راستہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو درجۂ کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچالے جاتا ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات کا اثبات کرتا ہے۔

مگر ساتھ ہی ہر صفت کو تشبہ کے اثر سے بھی بچالیتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا زندہ ہے قدرت والا۔ پیدا کرنے والا رحمت والا سب کچھ دیکھنے سننے اور جاننے والا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن بلا تامل جگہ جگہ گوناگوں تمثیلات استعمال کرتا ہے لیکن اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ خدا کے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تصور میں آسکے اس کا زندہ رہنا ہمارے زندہ رہنے کی طرح نہیں اس کا دیکھنا سننا اور جاننا ویسا نہیں ہے جس طرح کہ ہم

دیکھتے سنتے اور جانتے ہیں۔اس کی قدرت و بخشش کی تعبیر کے لیے ہاتھ کی تشبیہ اور اس کے جلال اور ہر چیز پر محیط ہونے کی تمثیل کے واسطے عرش کا استعارہ ضرور ہے۔ لیکن اس کا مطلب وہ نہیں جو افعال انسانی کے تعلق سے ان الفاظ سے ہمارے ذہن میں منتقل ہونے لگتا ہے۔

قرآنی تصورالٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے ایک طرف بام حقیقت کی وہ بلندی کہ انسانی ذہن وفکر اس بلندی تک پہنچنے سے عاجز اور دوسری طرف انسانی فطرت کا اضطراب طلب اور ذوق دید اتنا شدید کہ جلوۂ حقیقت دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں۔تو تعطیل میں جا گرتے ہیں اور اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبیہہ اور تجسم میں کھو جاتے ہیں۔پس قرآن نے جو راستہ بتایا ہے وہ ایسا راستہ ہے کہ نہ تو اثبات صفات کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پاتا ہے اور نہ تنزیہہ کی باگ ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔اس لیے قرآن کا تصورالٰہی آریائی فلسفہ کے تصورالٰہی سے ممتاز ہے۔آریائی حکمت نے تلاش حقیقت کی سرگرمی میں خود ذات الٰہی کو مشخص کر دیا۔اور اس طرح مورتی پوجا کے دروازے کھول دیے قرآن نے اسے صرف صفات الٰہی کے تشخص سے پورا کر دیا۔خدا کے وجود کو مشخص نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ **تشبہ و تجسم** کے لیے کوئی امکان باقی نہ رہا۔خدا کی توحید کا قرآنی تصور ایک محکم تصور ہے۔وہ ایجابی اور سلبی دونوں پہلو رکھتا ہے۔ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک اور بس ایک ہے اور سلبی پہلو یہ ہے کہ اس کی مانند کوئی نہیں۔اور جب اس کے مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفات بھی اس کے لیے مختص کی جائیں ان میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔پہلی بات کو توحید فی الذات سے اور دوسری کو توحید فی الصفات سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔قرآن کے اس تصور سے قبل توحید کے ایجابی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔لیکن اس کا سلبی

پہلو نمایاں نہ ہوسکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے پہلے کے تمام مذاہب میں اگر چہ عقیدہ توحید کی تعلیم موجود تھی۔ لیکن کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی اصنام پرستی نمودار ہوتی رہی۔

ہندوستان میں تو غالباً روز ازل سے ہی یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ عوام کی تشفی کے لیے دیوتاؤں اور انسانی عظمتوں کی پرستاری ناگریز ہے اور خدائے واحد کی پرستش صرف خواص کا حصہ قرار دی گئی۔ فلاسفہ یونان کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ کوہ المپس کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں تاہم سقراط کے علاوہ کسی نے بھی اس کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ عوام کے اصنامی عقائد میں خلل انداز ہو۔ انہیں اندیشہ یہ تھا کہ اگر دیوتاؤں کی پرستش کا نظام قائم نہ رہا تو عوام کی سماجی و مذہبی زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں کسی بانی مذہب کو جو مرتبہ عطا کیا جاتا تھا وہ بطور خاص قابل غور ہے۔ یہ درست ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و رفعت حاصل نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ معلّم کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں۔ اسی مقام پر پہنچ کر بہتوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ کیونکہ وہ اس کی ٹھیک حد بندی نہ کر سکے نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مذہب یا فلسفہ کے معلّم کی شخصیت کو کبھی خدا کا اوتار بنا دیا گیا۔ تو کبھی ابن اللہ سمجھ لیا گیا اور یہ نہ ہوا تو اس کی تعظیم و بندگی کی سی شان پیدا کر دی گئی۔ مثلاً یہودیوں نے بلاشبہ ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بتوں کی پوجا کی ہو۔ تاہم انہوں نے بھی اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کر کے انہیں عبادت گاہوں کی سی شان و تقدیس دے دی گوتم بدھ کی نسبت معلوم ہے کہ اس کی تعلیم میں اصنام پرستی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اس کی آخری نصیحت جو ہم تک پہنچی ہے یہ ہے کہ "ایسا نہ کرنا کہ میری نعش کی راکھ کو پوجنا شروع کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین جانو نجات کی راہ تم پر بند ہو جائے گی۔" لیکن ان پیرؤوں نے اس وصیّت پر جیسا عمل کیا ہمارے سامنے ہے۔ نہ صرف یہ کہ بدھ کی خاک اور یادگاروں پر انہوں نے معبد تیار کیے

بلکہ بدھ مت کی اشاعت کا ذریعہ ہی یہ سمجھا گیا کہ بدھ کے مجسموں سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی ذات یا معبود کے آج اتنے مجسمے نہیں ہیں جتنے کہ گوتم بدھ کے ہیں اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی اصلی تعلیم سرتا سر توحید کی تعلیم تھی لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ الوہیت مسیحؑ کا عقیدہ نشو ونما پا چکا تھا۔ اس کے برعکس قرآن نے توحید فی الصفات اور توحید فی الذات کا ایک ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ شرک اور کفر اور اس کے مماثل دوسری لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے اور خدا کے تصور کے بارے میں یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیّت ہے۔

قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے آگے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

قرآن کہتا ہے۔ یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی اسی کا شریک بنالیا تو گویا اسے تم نے خدا کی خدائی میں شریک ٹھہرالیا اور تمہارا عقیدہ توحید درہم برہم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" (۱:۵) کی تلقین کی گئی ہے اور پورا زور ایاک پر ہے تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد اشراک پر زور دیا گیا کہ شاید ہی کوئی سورہ بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

اور یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم قرآن میں پیغمبر اسلام کو جو مرتبہ دیا گیا ہے۔ اس پر نظر ڈالتے ہیں۔ قرآن میں بار بار کہا گیا کہ پیغمبر اسلام ایک بشر اور خدا کے بندے ہیں۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ ہی یہ قرار دیا ہے کہ:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہے۔

اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ اس بات کا کوئی موقع نہ رہے۔ کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو، کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ اللہ کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے۔

یہی وجہ تھی کہ پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد اگرچہ مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن پیغمبر ﷺ کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی نزاعی سوال پیدا نہیں ہوا ابھی آپ کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے کہ پیغمبر کے خسر اور اسلام کے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے برسرِ ممبر اعلان کر دیا کہ:۔

> ''جو کوئی تم میں سے محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا سو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ نے وفات پائی اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اس کے لیے موت نہیں''۔

قرآن سے پہلے مذہبی عقائد کی تعلیم میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں خداشناسی کے تین درجے قرار دیئے گئے تھے۔ عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لیے براہ راست خدا کی پرستش اور اخص الخواص کے لئے وحدت الوجود کا مشاہدہ یہی حال فلاسفہ یونان کا تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم و حکمت ہی کر سکتے تھے۔ عوام کے لیے اسی میں امن ہے کہ

دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔لیکن قران نے اس امتیاز کو یک قلم مسترد کردیا۔اس نے سب کو خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لیے صفات الٰہی کا ایک تصور پیش کیا۔ وہ حکماء اور عرفا سے لے کر ایک چرواہے اور دہقان تک سب کو حقیقت کا ایک جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔

اس سلسلہ میں معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ ہندوستان میں خواص وعوام کے خدا پرستانہ تصورات کے درمیان جو فرق مراتب ملحوظ رکھا گیا ہے۔وہ معاملہ کو اس رنگ میں بھی نمایاں کرتا ہے کہ یہاں کا مذہبی نقطۂ خیال ابتداء سے فکر وعمل کی رواداری پر مبنی رہا ہے گویا ہر مذہبی عقیدے اور عمل کے لیے گنجائش نکالی گئی اور ہر فکر کو آزادانہ نشوونما کا موقع دیا گیا۔مذہبی اختلافات جو دوسری قوموں میں باہمی جنگ وجدال کا باعث رہے یہاں آپس کے سمجھوتوں کا ذریعہ ہے تفاہم اور تطابق گویا یہاں کے ذہنی مزاج کی ایک عام خصوصیت تھی ایک دیدانتی جانتا ہے۔کہ اصل حقیقت اشراک اور بت پرستی کے عقائد سے بالاتر ہے تاہم وہ بت پرستی کا مخالف اور منکر نہیں ہوجاتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے راستے کی یہ پہلی منزل ہے اور راہ رو چاہے کوئی راستہ اختیار کرے مگر مقصود اصلی ہر حال میں سب کا ایک ہی ہے۔

بلاشبہ فکر وعمل کی اس روادارانہ سوچ کا جو ہندوستان کی تاریخ میں برابر ابھرتی رہی ہے۔ہمیں اعتراف کرنا چاہیے لیکن زندگی عمل اور ردعمل کا مظہر ہوتی ہے اور اگر ہم اس راہ میں حد بندی کے خطوط قائم نہ کریں تو علم واخلاق کے تمام احکام درہم برہم ہوجائیں گے۔ اور اخلاقی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہ رہے گی۔رواداری یقیناً ایک خوبی کی بات ہے لیکن ساتھ ہی عقیدہ کی مضبوطی رائے کی پختگی اور فکر کی استقامت بھی زندگی کے ایسے پہلو ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا پس یہاں کوئی حد فاصل ضرور ہونی چاہیے جو ان تمام

خوبیوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم رکھے ورنہ اخلاق کے تمام احکام کو مناسب طور پر روبہ عمل نہیں لا یا جاسکتا۔ جوں ہی یہ خطوط کمزور ہو جاتے ہیں اور ملنے لگتے ہیں اخلاق کی پوری دیوار ہلنے لگتی ہے بلکہ اخلاق کی پوری دیوار ہل جاتی ہے مثلاً عفوودرگزر بڑی ہی حسن وخوبی کی بات ہے لیکن یہی عفوودرگزر جب اپنی جائز حدود سے آگے نکل جاتا ہے۔ تو عفوودرگزر نہیں رہتا بلکہ بزدلی اور بے ہمتی قرار پاتا ہے۔ شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گزر جائے گا تو ظلم وتشدد بن جائے گا۔

دو حالتیں ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہوسکتا۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی خاص اعتقاد اور عمل کی روشنی ہمارے سامنے آ گئی ہے اور ہم اس کے بارے میں ایک خاص نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں یا متزلزل ہو جائیں، دوسری حالت یہ ہے جس طرح ہم کسی خاص نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بعض خاص نتیجوں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب ان کی نسبت ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہماری طرح انہیں بھی اپنی راہ چلنے کا حق ہے یا نہیں رواداری یہ ہے کہ اپنے حق و اعتقاد وعمل کے ساتھ دوسروں کے حق اعتقاد وعمل کا اعتراف بھی کیجئے اور اگر ان کا راستہ آپ کو صریحاً غلط دکھائی دے رہا ہے۔ تب بھی ان کے اس راستے پر چلنے کے حق سے انکار نہ کیجئے لیکن اگر رواداری کی حدود کو یہاں تک بڑھا دیا جائے کہ وہ آپ کے عقیدوں میں بھی مداخلت کرنے لگے اور آپ کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہونے لگے تو پھر یہ رواداری نہ ہوئی۔

مفاہمت زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے ہماری زندگی بجائے خود سرتاسر مفاہمت ہے لیکن اس کی بھی کوئی حد ہوتی ہے تاکہ آپ اپنے عقیدہ محفوظ رکھ سکیں لیکن تاوقتیکہ اس میں تبدیلی کے لیے کوئی اندرونی روشنی آپ کے سامنے نہ آئے۔ آپ مجبور ہیں کہ آپ اس

پر جمے رہیں اوراس پر قائم رہنے کا آپ کو حق ہے۔ آپ دوسروں کے عقائد کا احترام ضرور کریں گے۔ لیکن اپنے حق پر بھی مصر رہیں گے اور اپنے عقیدہ کو کمزوری کے حوالے نہ ہونے دیں گے۔ ان دو حالتوں میں فرق وامتیاز کی وجہ سے اعتقاد وعمل کی دنیا میں کتنی ہی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اگر اعتقاد کی مضبوطی آئی تو اتنی دور تک چلی گئی۔ کہ رواداری کے تمام تقاضے بھلا دیئے گئے اور دوسروں کے اعتقاد وعمل میں جبراً مداخلت کی جانے لگی۔ بعض اوقات رواداری کو اتنا آگے بڑھا دیا گیا کہ استقامت فکر ورائے کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی پہلی بے اعتدالی کی مثالیں ہمیں مذہبی تنگ نظریوں اور سخت گیریوں کی تاریخ میں ملتی ہیں اور دوسری بے اعتدالی کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ مہیا کر دیتی ہے یہاں فکر وعقیدہ کی کوئی بلندی بھی وہم وجہالت کی گراوٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی اور علم وعقل اور وہم وجہل میں ہمیشہ سمجھوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان سمجھوتوں نے ہندوستانی دل ودماغ کی شکل وصورت بگاڑ دی اور اس کی فکری ترقی کا تمام حسن اصنامی عقیدوں اور وہم پرستیوں کے گرد وغبار میں چھپ گیا۔ ہندوستان کے عصری مورخوں نے اس صورت حال کا اعتراف کیا۔ ہمارے عہد کے ایک لائق ہندو مصنف ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس دور کی فکری حالت پر نظر ڈالتے ہوئے جب کہ آریائی تصورات ہندوستان کے مقامی مذاہب سے مخلوط ہونے لگے تھے تسلیم کیا ہے کہ:۔

> ”ہندو مذہب کی مخلوط نوعیت کی توضیح ہمیں اس صورت حال میں مل جاتی ہے۔ صحرا نورد قبائل کے وحشیانہ توہمات سے لے کر اونچے سے اونچے درجے کے تہہ اس غور وخوض تک ہر درجہ اور ہر دائرہ فکر کے خیالات یہاں باہم دگر ملتے اور مخلوط ہوتے رہے آریائی مذہب اول روز سے کشادہ دل خودرو اور روادار تھا وہ جب کبھی کسی نئے موڑ سے

دو چار ہوا تو خود سمٹتا گیا۔ اور جگہیں نکالتا گیا اس کی اس مزاجی حالت میں ہم ایک سچے انکسار طبع اور ہمدردانہ مفاہمت کا شائستہ رجحان محسوس کرتے ہیں۔ ہندو دماغ اس کے لیے تیار نہیں ہوا کہ نچلے درجے کے مذہبوں کو نظر انداز کر دے یا لڑ کر ان کی ہستی مٹا دے۔ اس کے اندر ایک مذہبی جنون کا غرور نہیں تھا کہ صرف اسی کا سچا مذہب ہے۔ اگر انسانوں کے ایک گروہ کو کسی ایک معبود کی پرستش، اس کے طور طریقے پر تسکین قلب مہیا کر دیتی ہے۔ تو تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ بھی ایک سچائی کی ایک راہ ہے مکمل سچائی پر کوئی بیک دفعہ قابض نہیں ہو جا سکتا۔ وہ صرف بتدریج اور بتفریق ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور یہاں ابتدائی اور عارضی درجوں کو بھی ان کی ایک جگہ دینی پڑتی ہے۔ ہندو دماغ نے رواداری اور باہمی مفاہمت کی یہ راہ اختیار کر لی لیکن وہ یہ بات بھول گیا کہ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جب رواداری کی جگہ نارواداری ایک فضیلت کا حکم پیدا کر لیتی ہے اور مذہبی معاملات میں بھی گریشم کے قانون کی طرح کا ایک قانون کام کرتا رہتا ہے جب آریائی اور غیر آریائی مذاہب باہم گر ملے ایک شائستہ اور دوسرا ناشائستہ، ایک اچھی قسم کا، دوسرا نکما تو غیر شائستہ اور نکمے جن میں قدرتی طور پر یہ میلان پیدا ہو گیا کہ شائستہ اور اچھے اجزا کو دبا کر معطل کر دے۔''[۲]

---

۲ : انڈین فلاسفی۔ از ڈاکٹر رادھا کرشنن جلد اول ص ۱۱۹ دوسرا ایڈیشن

قرآن کے تصورِ الٰہی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کسی طرح اعتقادی مفاہمت کو جائز نہیں رکھا وہ خدا کے توحیدی اور تنزیہی تصور میں سرتاسر بے میل اور بے لچک رہا تاہم وہ کسی عنوان میں بھی دوسرے عقائد کے بارے، روادارانہ طرزِ عمل سے ہمیں روکتا نہیں البتہ اعتقادی مفاہمتوں کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

قرآن نے تصورِ الٰہی کی بنیاد انسان کے عالمگیر وجدانی احساس پر رکھی ہے یہ نہیں کیا کہ اسے نظر و فکر کی کاوشوں کا ایک ایسا معمہ بنا دیا ہو جسے خاص طبقہ کا ذہن ہی حل کر سکے۔ زندگی کے بارے میں انسان کا عالمگیر وجدانی احساس کیا ہے یہ ہے کہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوگئی۔ پیدا کی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک صانع ہستی موجود ہو۔ قرآن بھی اس بارے میں جو کچھ بتلاتا ہے۔ وہ اتنا ہی ہے اس سے زیادہ جو کچھ ہے مذہبی عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ اس کا بوجھ جماعت کے افکار پر نہیں ڈالتا بلکہ اسے اصحاب جہد وطلب کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (٢٩ : ٦٩)

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لیے کوشش کریں گے تو ہم بھی ضرور ان پر راہ کھول دیں گے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (٥١ : ٢٠-٢١)

اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے زمین میں کتنی ہی حقیقت کی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اندر بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں۔

اسی مقام سے وہ فرق مراتب بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جو اسلام نے بالکل ایک مختلف شکل ونوعیت میں عوام اور خواص کے درمیان ملحوظ رکھا ہے۔ ہندو مفکروں نے سماج کے مختلف طبقات میں الگ الگ تصور اور عقیدے تقسیم کیے لیکن اسلام نے تصور اور عقیدے کے اعتبار سے اس قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ وہ ہر انسانی دل ودماغ کے آگے حقیقت کا

ایک عقیدہ پیش کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ طلب وجہد کے لحاظ سے سب کے مراتب یکساں نہیں ہو سکتے ہر طالب حقیقت ایک ہی قسم کی تشنگی لے کر نہیں آتا۔ عامۃ الناس بحیثیت ایک طبقہ کے اپنا ایک خاص مزاج اور اپنی خاص احتیاج رکھتے ہیں۔ لیکن خاص افراد بحیثیت فرد کے اپنی طلب واستعداد کا الگ الگ درجہ ومقام رکھتے ہیں اور ان کے لیے عرفان ویقین کی راہیں کھلی چھوڑ دی گئی ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے جو نہایت جامع اور مانع الفاظ میں اس فرق مراتب کو ظاہر کرتی ہے یہ حدیث تین مرتبوں کا ذکر کرتی ہے اسلام ایمان اور احسان، اسلام یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کا اقرار کرنا ہر عمل کے چاروں ارکان یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو انجام دینا ایمان یہ ہے کہ اقرار کے مرتبہ سے آگے بڑھنا اور اسلام کے بنیادی عقائد کے حق الیقین کا مرتبہ حاصل کرنا اور احسان یہ ہے کہ:

حدیث : اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ وَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (صحیحین)

تو اللہ کی اس طرح عبادت کرے گویا اسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد وعمل کا ہے۔ یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا۔ اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی وہ اس دائرہ میں آ گیا لیکن محض دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آ جاتا کہ علم ویقین کے مقامات بھی حاصل ہو گئے۔

پہلا مرتبہ صرف اس کے خارجی اور ابتدائی پہلو کا مظہر ہوتا ہے دوسرا مرتبہ ایمان کا ہے یہ انسان کے دل ودماغ کا ایمان ویقین واذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا۔ وہ خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفان حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ اس کے بعد آتا ہے جسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن یہ مقام محض

اعتقاد اور یقین پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک جماعت یا گروہ کو بحیثیت جماعت یا گروہ کے حاصل ہو جا سکتا ہے۔ یہ مقام ذاتی تجربہ وکشف سے حاصل ہوتا ہے۔ محض تعلیمی عقائد یا فکری قیاسات سے اس مرتبہ تک رسائی نہیں ہوتی۔ یہ سیکھنے اور بتلانے کا معاملہ نہیں۔ ذاتی تجربہ مختلف کا معاملہ ہے جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ بتلائے گا تو بھی یہی بتلائے گا۔ کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو:

پرسید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو من شوب دانی

اسلام نے اس طرح طلب وجہد کی روحانی پیاس کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان مہیا کر دیا۔ عام آدمی کے لیے پہلا مرتبہ ہے زیادہ ترقی یافتہ انسان کے لیے دوسرا مرتبہ اور خاصان خاص کے لیے تیسرا مرتبہ ہر چند کہ ہر ایک کے لیے جام الگ الگ ہیں لیکن پیاس بجھانے کے واسطے میخانہ ایک ہی ہے ہر ایک کے حصہ میں اس کے ظرف کے مطابق ایک جام آ جاتا ہے۔

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خم دہد اما
در مجلس او مستی ہر کس زشرابے است

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ علمائے اسلام خصوصاً صوفیائے کرام نے خدا کے بارے میں ایک تصور کیا ہے۔ جو عام طور سے نظریہ وحدت الوجود کہلاتا ہے۔ توحید وجودی کے قائل قرآن کی مختلف آیات سے اس نظریہ پر استدلال لاتے ہیں۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ O(۵۷: ۳) فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲: ۱۱۵) "اور " وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰: ۱۶)" اور كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ "(۵۵: ۲۹) وغیرہ وغیرہ

دہلی کے مشہور محدث شاہ ولی اللہ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں مسئلہ وحدت

الوجود کو ثابت کرنا چاہوں تو قران وحدیث کے تمام نصوص وظواہر سے اس کا اثبات کر سکتا ہوں۔لیکن مولانا آزاد متنبہ کرتے ہیں کہ اس بارے میں صاف بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ ان تمام تصریحات کو ان کے قریبی محامل سے دور نہیں لے جانا چاہیے۔اور ان معانی سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے جو صدر اول کے مسلمانوں نے سمجھے تھے۔ باقی رہا حقیقت کے کشف وعرفان کا وہ مقام جو عرفا طریق کو پیش آتا ہے تو وہ کسی طرح قرآن کے تصورِ الٰہی کے عقیدہ کے خلاف نہیں۔قرآن کا تصورِ الٰہی ایک جامع تصور ہے اور ہر توحیدی تصور کی اس میں گنجائش جو افراد خاصہ مقام واحسان تک رسائی حاصل کرتے ہیں وہ حقیقت کو اس کی پس پردہ جلوہ طرازیوں میں بھی دیکھ لیتے ہیں اور عرفان کا وہ منتہیٰ مرتبہ جو فکر انسانی کے دسترس میں ہے انہیں حاصل ہوتا ہے۔

☆☆ OOO ☆☆

باب دوم

صفت ربوبیّت

صفات الٰہی کے ذکر میں مولانا آزاد ایک عام جائزہ لیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔کہ کائنات کے نظام ہستی میں وحدت وجود کا جلوہ وحدت صفات کی شکل میں دکھائی دیتا ہے یعنی صفات الٰہی کا الگ الگ اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ظاہر ہوتی ہیں۔تا کہ زندگی میں ہم آہنگی کا جلوہ نظر آئے۔سورۃ فاتحہ یا قرآن کے افتتاحی باب میں خدا کی چند بنیادی صفات کا ذکر کیا گیا ہے جیسے ربوبیت، رحمت، عدالت اور ہدایت کی صفات۔مولانا آزاد اپنی تفسیر میں بالترتیب ان صفات پر روشنی ڈالتے ہیں اور پورے قرآن سے ان کی جلوہ نمائی کے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔سب سے پہلے وہ خدا کی اوّلین صفت یعنی ربوبیت کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن کی توجہ کا مرکز ہے۔

ربوبیت کی اصطلاح رب سے نکلی ہے جو سامی زبانوں کے کئی الفاظ کا مشترک ہے۔ عبرانی، عربی، اور سریانی تینوں زبانوں میں ''رب'' کے معنی پالنے والے کے ہیں یا ایسی ہستی جو اسباب پرورش مہیا کرتی ہے۔چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لیے رب کے لفظ کو جو معنی عطا کئے گئے گویا وہ خدا کے تصور کا پہلا قدرتی زینہ تھے۔جس کے بارے میں ابتدائی سامی ذہن نقش آرائی کر سکتا تھا۔رب کے معنی معلم آقا یا خدا کے بھی ہیں۔قرآنی زبان میں اس لفظ کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی لیے بعض علمائے لغت نے ربوبیت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے''ھو انشاء الشیی حالاً فحالاً الیٰ حد التمام'' یعنی کسی چیز کو

یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشو ونما دیتے رہنا کہ اپنی حد تک پہنچ جائے یعنی ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں ان سب کا سر و سامان ہوتا رہے لیکن قرآنی تصور کے لحاظ سے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ربوبیت میں شفقت کا لگاؤ ضروری ہے وہ ایک تمثیل کے ذریعہ ان معنوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو محض گوشت پوست کا ایک متحرک لوتھڑا ہوتا ہے زندگی اور نمو کی جتنی قوتیں بھی رکھتا ہے سب کی سب پرورش و تربیت کی محتاج ہوتی ہیں یہ پرورش محبت و شفقت ،حفاظت و نگہداشت اور بخشش و اعانت کا ایک طول طویل سلسلہ ہے اور اس وقت جاری رہتا ہے جب تک بچہ اپنے جسم و ذہن کے حد بلوغ تک نہ پہنچ جائے پھر پرورش کی ضرورتیں ایک دو نہیں بے شمار ہیں، ان کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اور ضروری ہے کہ عمر اور ہر حالت کے مطابق محبت کا جوش نگرانی کی نگاہ اور نگرانی کا سر و سامان ملتا رہے حکمت الٰہی نے ماں کی محبت میں ربوبیت کے یہ تمام خد و خال پیدا کر دیئے ہیں، یہ ماں کی ربوبیت ہی ہے جو پیدائش کے دن سے لے کر بلوغ تک بچہ کو پالتی، بچاتی، سنبھالتی اور ہر وقت اور ہر حالت کے مطابق اس کی ضروریات پرورش کا سر و سامان مہیا کرتی رہتی ہے جب بچہ کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے۔ جب دودھ سے قوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے ویسی ہی غذا دی جانے لگتی ہے۔ جب بچہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں ہوتی تو ماں اسے گود میں اُٹھائے پھرتی ہے۔ جب وہ کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتا ہے تو ماں اس کی انگلی پکڑ کر اس کو ایک ایک قدم چلاتی ہے۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی اور حفاظت کا

ایک مسلسل اہتمام جاری رہے وہ صورت حال ہے۔جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جاسکتا ہے۔قرآن نے رب کی حیثیت سے خدا کا جو تصور پیش کیا ہے۔اس تمثیل کی روشنی میں آسانی سے اسے ذہن نشین کیا جاسکتا ہے۔قرآن نے خدا کے ساتھ رب العالمین کی صفت کو وابستہ کیا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ خدا کسی خاص قوم یا گروہ کا رب پالنے والا نہیں ہے بلکہ بنی نوع انسان اور کائنات ہستی کی تمام مخلوقات کا رب ہے۔

نظام ربوبیت:

مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ ربوبیت الٰہی کا عمل ایک معینہ نظام کے تحت ہے، ہر وجود کو ہر حالت میں زندگی اور بقاء کے لیے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے، چیونٹی زمین پر رینگ رہی ہے، کیڑے مکوڑے، کوڑے کرکٹ میں اپنا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔مچھلیاں دریا میں تیر رہی ہیں، پرند ہوا میں اڑ رہے ہیں۔پھول باغوں میں کھل رہے ہیں۔لیکن فطرت کے پاس یکساں طور پر سب کے لیے پرورش کی گود اور نگرانی کی آنکھ ہے اور کوئی نہیں جو فیضان ربوبیت سے محروم ہو مخلوقات کی بے شمار قسمیں ایسی بھی ہیں جو اتنی حقیر اور بے مقدار ہیں کہ ہماری آنکھ انہیں دیکھ بھی نہیں سکتی لیکن ربوبیت الٰہی نے جس طرح اور جس نظام کے ساتھ ہاتھی جیسی مخلوق کے لیے سامان پرورش و نگہداشت مہیا کر دیا ہے۔ٹھیک اسی طرح اور ویسے ہی نظام کے ساتھ ان کے لیے بھی زندگی اور بقا کی ہر چیز مہیا کر دی اور جو کچھ ہے۔انسان کے وجود سے باہر ہے۔اگر انسان اپنے وجود کو دیکھے تو خود اس کی زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ربوبیت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کی ایک پوری کائنات ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۲۰ ۔ ۲۱)

ان لوگوں کے لیے جو (سچائی پر) یقین رکھنے والے ہیں زمین میں اور خود تمہارے وجود میں بھی پھر کیا تم دیکھتے نہیں؟

خارجی پہلو:

سامانِ زندگی کی بخشائش اور ربوبیت کے عمل میں جو فرق ہے قرآن اس فرق کو واضح کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے عناصر ایسی قوتیں اور ان کی ایسی مختلف شکلیں اور بناوٹیں موجود ہیں جو زندگی کی ترقی اور نشو ونما کے لیے سودمند ہیں لیکن محض ان کی موجودگی ربوبیت سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ ایسا ہونا قدرت الٰہی کی رحمت ہے مگر وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت یہ ہے کہ ان اشیاء کی بخشش وتقسیم کا بھی ایک نظام موجود ہے۔ مثلاً زندگی کے لیے پانی اور رطوبت کی ضرورت ہے لیکن پانی کی موجودگی بجاے خود زندگی کے لیے کافی نہیں جب تک کہ ایک مقررہ مقدار اور ایک خاص وقت انتظام کے ساتھ پانی موجود نہ ہو۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ اللہ کی رحمت ہے جس نے پانی جیسا جوہر پیدا کر دیا لیکن اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی۔ زمین کے گوشے گوشے تک پہنچاتی، ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۲۳۔۱۸۔۱۹)

اور دیکھو ہم نے آسمان سے ایک خاص انداز کے ساتھ پانی برسایا پھر اسے زمین میں ٹھہرائے رکھا اور ہم اس پر قادر ہیں کہ (جس طرح برسایا تھا اسی طرح اسے واپس لے جائیں، پھر (دیکھو) اسی پانی سے ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کر دیئے جس میں بے شمار پھل لگتے اور انہیں سے تم اپنی غذا بھی حاصل کرتے ہو۔

قرآن نے جابجا اشیاء کی قدر اور مقدار کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اس حقیقت کی طرف اشارہ

کیا ہے کہ فطرت کائنات جو کچھ بخشتی ہے ایک خاص اندازہ کے ساتھ بخشتی ہے اور یہ اندازہ ایک خاص نظام کے تحت ہوتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (۱۵: ۲۱)
وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ (۱۳: ۸) اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴۔۴۹)

اور کوئی شے نہیں جس کے پاس ہمارے ذخیرے موجود نہ ہوں لیکن ہمارا طریق کار یہ ہے کہ جو کچھ نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔ اور اللہ کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر ہے۔ ہم نے جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہیں۔

غور کیجئے! دنیا میں صرف یہی نہیں ہے کہ پانی موجود ہے بلکہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ موجود ہے یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر فضا میں چادریں بچھا دیں پھر ہواؤں کے جھونکے انہیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت اور خاص محل میں برسائیں۔ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص محل میں برسائیں۔ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی بالائی سطح پر اس کی ایک مقدار اور ایک خاص مقدار زمین کے اندرونی حصوں میں جذب ہو جائے۔

کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں۔ اور پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلنے لگتے ہیں۔ پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے اُبلنے لگتے ہیں۔ پھر چشموں سے دریا کی جدولیں بہنے لگتی ہیں۔ پھر یہ جدولیں پیچ و خم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک زمین کو سیراب کر دیتی ہیں۔

کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا۔ کیوں کسی دوسرے انداز سے نہ ہوا۔ قرآن اس کا جواب دیتا ہے اس لیے کہ کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضیٰ یہی تھا کہ

پانی اسی ترتیب سے بنے اور اسی ترتیب و مقدار سے تقسیم ہو۔ یہ رحمت و حکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا لیکن یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح کام میں لائی کہ ہر مخلوق کی پرورش اور رکھوالی کی ضرورتیں پوری ہو گئیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ○ (۳۰۔۴۸)

اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ پہلے ہوائیں چلتی ہیں پھر ہوائیں بادلوں کو چھیڑ کر حرکت میں لاتی ہیں پھر وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضا میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادلوں میں سے مینہ نکل رہا ہے پھر جن لوگوں کو یہ برکت ملنی تھی مل چکتی ہے تو اچانک خوش وقت ہو جاتے ہیں۔

زندگی کے لیے جن چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی انہی کی بخشائش سب سے زیادہ اور عام ہے اور اسی طرح جن کی ضرورت خاص خاص حالتوں میں یا خاص خاص موقعوں کے لیے تھی ان میں اختصاص اور مقامیت پائی جاتی ہے ہوا سب سے زیادہ ضروری تھی۔ کیونکہ پانی اور غذا کے بغیر کچھ عرصہ تک زندگی ممکن ہے۔ مگر ہوا کے بغیر ممکن نہیں پس اس کا سامان اتنا وافر اور عام ہے زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جو کسی وقت بھی اس سے خالی ہو، ہوا کے بعد دوسرے درجے پر پانی ہے اس لیے اس کی بخشائش کی فراوانی اور عمومیت کا درجہ ہوا کے بعد ہے دنیا کے ہر حصہ میں زمین کے اوپر ہر طرف دریا رواں ہیں اور زمین کے نیچے بھی پانی کے سوتے بہہ رہے ہیں پھر ان دونوں ذخیروں کے علاوہ فضائے آسمانی کا بھی کارخانہ ہے جو شب و روز سرگرم کار رہتا ہے وہ سمندر کا شورابہ کھینچتا ہے۔ اسے صاف و شیریں بنا کر جمع کرتا رہتا ہے پھر حسب ضرورت زمین کے حوالے کر دیتا ہے ہوا اور پانی کے بعد غذا کی ضرورت تھی لہٰذا ہوا اور

پانی سے کم اور تمام چیزوں سے زیادہ اس کا دستر خوان کرم پورے کرہ ارض پر بچھا ہوا ہے اور کوئی مخلوق نہیں جس کے آگے اس کی غذا کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔

پھر سامان پرورش کے اس عالمگیر نظام پر غور کرو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام کارخانہ صرف اس لیے بنا ہے کہ زندگی بخشے اور زندگی کی ہر استعداد کی رکھوالی کرے، سورج اس لیے ہے کہ روشنی کے لیے چراغ اور گرمی کے لیے تنور کا کام دے اور اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر سمندر سے پانی کھینچتا رہے ہوائیں اس لیے ہیں کہ اپنی سردی اور گرمی سے مطلوبہ اثرات پیدا کرتی رہیں۔ کبھی پانی کے ذرات جما کر ابر کی چادریں بنا دیں اور کبھی ابر کو پانی بنا کر برسا دیں۔ زمین اس لیے ہے کہ نشو و نما کے خزانوں سے ہمیشہ معمور رہے اور ہر دانے کے لیے اپنی گود میں زندگی اور ہر پودے کے لیے اپنے سینے میں پروردگی رکھے۔ مختصر یہ کہ کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ صرف اسی کام میں لگا ہوا ہے، ہر قوت اپنی استعداد کا مظاہرہ کر رہی ہے اور ہر علت اپنی تاثیر کے اظہار میں لگی ہوئی ہے جونہی کسی وجود میں بڑھنے اور نشو و نما پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ معاً تمام کارخانۂ ہستی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی تمام کار فرمائیاں فضا کے تمام تغیرات زمین کی تمام قوتیں اور عناصر کی تمام سرگرمیاں صرف اسی انتظار میں رہتی ہیں کہ کب چیونٹی کے انڈے سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور کب دہقان کی جھولی سے ایک دانہ زمین پر گرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵۔ ۱۳)

اور آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے سب کو اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفت حقیقت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب مگر سب سے زیادہ نمایاں حقیقت نظام

ربوبیت کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہے یعنی ہر وجود کی پرورش کا سروسامان جس طرح اور جس اسلوب پر کیا گیا ہے۔ وہ ہر گوشے میں ایک ہی ہے اور ایک ہی اصل وقاعدہ رکھا ہے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا گلاب کے شاداب اور عطر بیز پھول سے کتنا ہی مختلف دکھائی دے لیکن دونوں کو ایک ہی طریقہ سے سامان پرورش ملا ہے اور دونوں ایک ہی طرح سے پالے پوسے جا رہے ہیں۔ ایک انسان کا بچہ اور درخت کا ایک پودا، بظاہر دو الگ الگ حیثیتوں کے مظہر دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی نشوونما کے طریقوں کا کھوج لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ قانون پرورش کی یکسانیت نے دونوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پتھر کی چٹان ہو یا پھول کی کلی، انسان کا بچہ ہو یا چیونٹی کا انڈا سب کے لیے پیدائش کا وقت مقرر ہے اور قبل اس کے کہ پیدائش ظہور میں آئے سامان پرورش مہیا ہو جاتا ہے پھر یکے بعد دیگرے طفولیت، رشد وبلوغ، شباب، سن کمال اور بالآخر ضعف وانحطاط کی منزلیں آتی ہیں، زندگی کے ظہور، نشوونما اور زوال وانحطاط کا افسوس سب کے لیے ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ (۳۰-۵۴)

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ پہلے ناتوانی کی حالت ہوتی ہے پھر ناتوانی کے بعد قوت آتی ہے پھر قوت کے بعد دوبارہ ناتوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ علم اور قدرت رکھنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ (۳۹-۲۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا زمین میں اس کے چشمے رواں

ہو گئے پھر اسی پانی سے رنگ برنگ کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں پھر ان کی نشو و نما میں ترقی ہوئی اور پوری طرح پک کر تیار ہو گئیں پھر (ترقی کے بعد زوال طاری ہوا اور) تم دیکھتے ہو کہ ان پر زردی چھا گئی بالآخر خشک ہو کر چور چور ہو گئیں۔ بلاشبہ دانشمندوں کے لیے اس صورت حال میں بڑی عبرت ہے۔

جہاں تک غذا کا تعلق ہے، حیوانات میں ایک قسم ان جانوروں کی ہے۔ جن کے بچے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ایک ان کی ہے جو عام غذاؤں سے پرورش پاتے ہیں۔ غور کرو۔ نظام ربوبیت نے دونوں کی پرورش کے لیے کیا عجیب سر و سامان مہیا کر دیا ہے۔ انسان کو لے لو، جونہی وہ پیدا ہوتا ہے اسی کی غذا اپنی ساری خاصیتوں اور مناسبتوں کے ساتھ خود بخود مہیا ہو جاتی ہے اور ایسی جگہ سے مہیا ہوتی ہے جو اس کے لیے سب سے قریب اور موزوں ہے ماں اپنے نومولود بچے کو جوش اور محبت میں سینے سے لگا لیتی ہے اور وہیں اس کی غذا کا سرچشمہ بھی موجود ہوتا ہے۔ پھر دیکھو اس غذا کی نوعیت مزاج میں اس کی حالت کا درجہ بدرجہ کس قدر لحاظ رکھا گیا ہے اور کس طرح یکے بعد دیگرے اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، ابتدا میں بچہ کا معدہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بہت ہی ہلکے قوام کا دودھ ملنا چاہیے۔

چنانچہ نہ صرف انسان میں بلکہ تمام حیوانات میں ماں کا دودھ بہت ہی ہلکے قوام کا ہوتا ہے لیکن جوں جوں بچے کی عمر اور معدہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ دودھ کا قوام بھی بدلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بچے کا عہد رضاعت پورا ہو جاتا ہے اور پھر اس کا معدہ عام غذاؤں کے ہضم کرنے کی استعداد پیدا کر لیتا ہے اور اس منزل پر ماں کا دودھ خشک ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ربوبیت الٰہی کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب اس کے لیے دودھ کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر طرح کی غذا استعمال کر سکتا ہے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (۴۶-۱۵)

اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت (کم از کم) تیس مہینوں کی ہے۔

پھر دیکھو! کارسازِ فطرت کی یہ کیسی کرشمہ سازی ہے کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی جاتی ہے۔ محبت مادری کا یہ شعلہ خود بخود دھیما پڑتا جاتا ہے۔ یہ محبت مادری ہے جو ماں کے دل میں شریف ترین جذبات کو نشو ونما دیتی ہے اور اپنے بچے کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی پھر جوں جوں بچہ بڑھتا جاتا ہے۔ محبت مادری کے جذبہ کی شدت کم ہوتی جاتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ جذبہ حیوانات میں تو بالکل باقی نہیں رہتا لیکن انسان میں بھی اس کی گرمجوشیاں باقی نہیں رہتیں، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی محبت کا ایک عظیم ترین جذبہ ماں کے دل میں موجزن ہو جائے اور پھر ایک خاص وقت تک قائم رہ کر رفتہ رفتہ غائب ہو جائے اس لیے کہ نظامِ ربوبیت کی کارفرمائی ہے اور اس کا مقتضیٰ یہی تھا۔ ربوبیت چاہتی ہے کہ جب تک بچہ کو پرورش کی احتیاج باقی رہے اس کی پرورش ہو اس لیے ماں کی محبت میں بھی بچے کی پرورش کا جوش اتنا ہی زیادہ تھا جب بچے کی عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ ماں کی پرورش کی احتیاج باقی نہ رہی۔ تو اس ذریعہ کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ اب اس کا باقی رہنا ماں کے لیے بوجھ اور بچے کی نشو ونما کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ بچے کی احتیاج کا سب سے نازک وقت اس کی نئی نئی طفولیت تھی اس لیے ماں کی محبت میں بھی سب سے زیادہ جوش اسی وقت تھا پھر جوں جوں بچہ بڑھتا گیا یہ احتیاج کم ہوتی گئی۔ بلاشبہ ماں کی محبت اپنے بچے کے لیے ہمیشہ زندہ رہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن اس کی محض ایک سماجی قدر ہوتی ہے۔ بچے کی طفولیت کے عہد میں محبت مادری کا جو فطری اور جبلی جوش ہوتا ہے وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

انسان اور حیوانات کے بچوں کی پرورش میں ضرور تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً جب

انڈے سے مرغی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت دودھ پینے والے بچوں سے مختلف ہوتی ہے وہ اول دن سے ہی معمولی اور عام غذائیں کھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کھلانے کے لیے کوئی شفیق نگرانی موجود ہو۔ چنانچہ جوں ہی مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے اپنی غذا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اور ماں چن چن کر غذا اس کے سامنے ڈالتی جاتی ہے اور منہ میں لے کر کھانے کا طریقہ بتاتی جاتی ہے یا ایسا کرتی ہے کہ خود کھالیتی ہے مگر ہضم نہیں کرتی، اپنے اندر اسے ہلکا نرم بنا کر محفوظ رکھتی ہے اور جب بچہ اپنی غذا کے لیے منہ کھولتا ہے تو اس میں اتار دیتی ہے۔

ربوبیت معنوی:

پھر اس سے بھی عجیب تر نظام ربوبیت کا معنوی پہلو ہے۔ خارج میں زندگی اور پرورش کا کتنا ہی سروسامان کیا جاتا ہے۔ مفید نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر ہر وجود کے اندر اس سے کام لینے کی ٹھیک ٹھیک استعداد ودیعت نہ ہوتی پس یہ ربوبیت ہی کا فیضان ہے کہ ہر مخلوق کی ظاہری اور باطنی بناوٹ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی ہر قوت اس کے سامان پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اس کی ہر چیز اسے زندہ رہنے اور نشو ونما پانے میں مدد دیتی ہے کوئی مخلوق اپنے جسم وقوی کی ایسی نوعیت نہیں رکھتی جو اس کے حالات پرورش کے تقاضوں کے خلاف ہو۔

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے زندگی کی دو حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے جن کی طرف قرآن نے بار بار متوجہ کیا ہے ایک وہ جسے تقدیر کہتے ہیں انگریزی میں اسے قسمت کا عام سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری حقیقت عبارت ہے ”ہدایت“۔

تقدیر:

تقدیر کے معنی کسی چیز کے لیے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے کے ہیں، خواہ یہ

ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ہر وجود کی جسمانی ساخت اور معنوی قویٰ کے لیے ایک خاص طرح کا اندازہ ٹھہرا دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں جاسکتا اور یہ اندازہ ایسا ہے جو اس کی زندگی اور نشو ونما کے تمام احوال وظروف سے ٹھیک ٹھیک مناسبت رکھتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ○ (۲۵۔۲)

اور اس نے تمام چیزیں پیدا کیں۔ پھر ہر چیز کے لیے (اس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ایک خاص) اندازہ ٹھہرا دیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ ہر گردوپیش میں اس کی پیداوار میں ہمیشہ مطابقت پائی جاتی ہے اور ایسا کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی پائی جاتی ہے اور ایسا مذہب کیوں ہے کہ ہر مخلوق اپنی ظاہری و باطنی بناوٹ میں ویسی ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کا گردوپیش ہے اور ہر گردوپیش ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اس کی مخلوقات ہوتی ہے؟ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ یہ اس کے حکیم وقدیر کی ٹھہرائی ہوئی تقدیر ہے اور اس نے ہر چیز کی خلقت وزندگی کے لیے ایسا ہی اندازہ مقرر کر دیا ہے اس کا یہ قانون تقدیر صرف حیوانات ونباتات کے لیے ہی نہیں بلکہ کائنات ہستی کی ہر چیز کے لیے ہے یہاں تک کہ سیاروں کا نظام بھی اسی سے وابستہ ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ○ (۳۶۔۳۸)

اور دیکھو، سورج کے لیے جو قرارگاہ ٹھہرادی گئی ہے۔ وہ اسی پر چلتا ہے اور یہ عزیز وعلیم خدا کی اس کے لیے تقدیر ہے۔

مخلوقات اور اس کے گردوپیش کی مطابقت کا یہی قانون ہے جس نے دونوں میں باہمدگر مناسبت پیدا کر دی ہے اور ہر مخلوق اپنے چاروں طرف وہی پاتی ہے جس میں اس کے لیے پرورش اور نشو ونما کا سامان ہوتا ہے اڑنے والا پرند، تیرنے والی مچھلی، چلنے والے چوپائے،

رینگنے والے حشرات ان میں سے ہر ایک کو ویسا ہی جسم ملا ہے جو اس کے گردوپیش کے لیے موزوں ہے۔ دریا میں پرند نہیں پیدا ہوتا اس لیے کہ گردوپیش اس کے تقاضائے پرورش کے مطابق نہیں، خشکی میں مچھلی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ خشکی اس کی حیات کے لئے موزوں نہیں، اگر فطرت کی اس تقدیر کے خلاف ایک خاص گردوپیش کی مخلوق دوسرے قسم کے ماحول میں چلی جاتی ہے تو یا تو وہاں زندہ نہیں رہتی یا زندہ رہتی ہے تو پھر بتدریج اس کی جسمانی ساخت اور طبیعت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی اس گردوپیش میں ہونی چاہیے پھر ان سے ہر نوع کے لیے مقامی موثرات کے مختلف گردوپیش ہیں سرد آب وہوا کی پیداوار سرد آب وہوا کے لیے ہے اور گرم آب وہوا کی مخلوق گرم آب وہوا کے لیے ہے قطب شمالی کے قرب وجوار کا ریچھ خط استواء کے قرب میں نظر نہیں آسکتا اور منطقہ حارہ کے جانور منطقہ باردہ میں مفقود ہیں اور یہی قانون فطرت یا قانون تقدیر ہے آیئے ہم ربوبیت کے دوسرے عنصر یعنی ہدایت پر نظر ڈالیں۔

ہدایت کے معنی راہ دکھانے، راہ پر لگانے، رہنمائی کرنے کے ہیں اور اس کے مختلف مراتب واقسام ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی یہاں صرف اس ابتدائی مرتبہ ہدایت کا ذکر کرنا ہے جو تمام مخلوقات پر ان کی پرورش کی ضروری راہیں کھولتا انہیں زندگی کی راہ پر لگاتا اور ضروریات زندگی کی طلب وحصول میں رہنمائی کرتا ہے فطرت کی یہ ہدایت ربوبیت کی ہدایت ہے اور اگر یہ ہدایت ربوبیت کی دستگیر نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ کوئی مخلوق بھی دنیا کے سامان حیات وپرورش سے فائدہ اٹھا سکتی اور زندگی کی سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں اس کے بغیر ساز ہستی ہی خاموش ہو جاتا، قرآن کہتا ہے کہ یہ ہدایت وجدان کا فطری الہام ہے اور حواس و ادراک کی قدرتی استعداد ہے۔ یہ فطرت کی رہنمائی ہے ہمارے اندر پہلے وجدان کا الہام بن کر نمودار ہوتی ہے پھر حواس وادراک کا چراغ روشن کر دیتی ہے یہی وہ باطنی قوت ہے جو ہر مخلوق کو زندگی اور پرورش کی راہوں پر لگا دیتی ہے انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا جوں ہی شکم مادر سے باہر

آ تا ہے جبلی طور پر معلوم کر لیتا ہے کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور جب پستان منہ میں لیتا ہے تو خود بخود انہیں چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ بلی کے بچوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں لیکن ماں جوش محبت میں انہیں چاٹ رہی ہے اور وہ اس کے سینے پر منہ مار رہے ہیں۔ یہ بچہ جس نے عالم ہستی میں ابھی ابھی قدم رکھا ہے جسے خارج کے موثرات نے چھوا تک نہیں، جبلی طور پر معلوم کر لیتا ہے کہ اسے پستان منہ میں لینا چاہیے اور اس کی غذا کا سرچشمہ یہیں ہے یہی وہ وجدانی ہدایت ہے جو قبل اس کے حواس و ادراک کی روشنی نمودار ہو بچے کو اس کی پرورش و زندگی کی راہوں پر لگا دیتی ہے۔

اگر تمہارے گھر میں بلی ہے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ جب وہ حاملہ ہوتی ہے تو کیا کرتی ہے؟ سمجھو کہ وہ پہلی مرتبہ حاملہ ہوئی ہے، اس حالت کا اسے کوئی تجربہ نہیں لیکن جونہی وضع حمل کا وقت قریب آتا ہے وہ کسی محفوظ گوشے کی جستجو شروع کر دیتی ہے اور کسی مناسب جگہ کے لیے مکان کا ایک ایک کونہ دیکھتی پھرتی ہے، پھر خود بخود ایک علیحدہ اور محفوظ ترین گوشہ چھانٹ لیتی ہے اور وہاں بچہ دیتی ہے پھر یکا یک اس کے اندر بچے کی حفاظت کی طرف سے ایک مجہول خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی جگہ بدلتی رہتی ہے، یہ کونسی قوت ہے جو بلی کے اندر یہ خیال پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرے کیونکہ عنقریب اسے جگہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ کون سا الہام ہے جو اسے خبردار کر دیتا ہے کہ بلا بچوں کا دشمن ہے اور ان کی بو سونگھتا پھرتا ہے اس لیے جگہ بدلتے رہنا چاہیے بلاشبہ یہ ربوبیت الٰہی کی وجدانی کیفیت و ہدایت ہے۔ جس کا الہام ہر مخلوق کے اندر اپنی نمود رکھتا ہے اور جو ان پر زندگی اور پرورش کی تمام راہیں کھول دیتا ہے۔

ہدایت کا دوسرا مرتبہ حواس اور مدرکات ذہنی کی ہدایت ہے اگرچہ حیوانات اس جوہر دماغ سے محروم ہیں جسے فکر و عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے تاہم فطرت نے انہیں بھی ان کی ضرورت کے

مطابق احساس وادراک کی اتنی قوت عطا کر دی ہے جو انہیں اپنی زندگی اور معیشت کے لیے درکار تھی اور جس کی رو سے وہ اپنے رہنے سہنے کھانے پینے توالد و تناسل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہتے ہیں لیکن حواس وادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کی ضرورت اور مقتضیات کے مطابق عطا کی گئی ہے، چیونٹی کی قوت شامہ بہت دوررس ہوتی ہے اس لیے اسی قوت کے ذریعہ سے اپنی غذا حاصل کرنا ہوتی ہے چیل اور عقاب کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں پرواز کرتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں، یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے کہ حیوانات کے حواس وادارک کی یہ حالت اول دن سے تھی یا احوال وظروف کی ضروریات اور قانون مطابقت کے موثرات سے بتدریج ظہور میں آئی ہے اس لیے کہ خواہ کوئی صورت ہو بہر حال یہ فطرت کی بخشی ہوئی استعداد ہے۔

اب یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کے مطابق ہر مخلوق کے لیے اس کی پرورش و معیشت کا ایک مکمل نظام کارفرما ہے جو ربوبیت الٰہی کا مظہر ہے۔ یہی ربوبیت الٰہی ہے جس نے ہر وجود کو اس کی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے مناسب وموزوں سامان پرورش (تسویہ) عطا کیا اور ہر مخلوق کے لیے اس کے خواص کے مطابق ایک خاص طرح کا اندازہ (تقدیر) ٹھہرادیا۔ اور پھر ہر مخلوق کو ایسا خارجی اور معنوی ادارک (ہدایت) بخشا کہ وہ دنیا کے سامان حیات سے پرورش ومعیشت کا پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ قرآن نے ربوبیت کے ان مراتب کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷: ۲:۳)

وہ پروردگار عالم جس نے پیدا کیا پھر اسے ٹھیک ٹھیک درست کر دیا اور جس نے ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرادیا پھر اس پر راہ (عمل) کھول دی۔

اس طرح قرآن نے ان مظاہر تخلیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو کائنات حیات میں سرگرم عمل ہیں ۔ ربوبیت الٰہی کے مراتب بیان کیے ہیں جس کی غرض وغایت یہ ہے کہ نہ صرف توحید الٰہی کا ثبوت فراہم کیا جائے بلکہ ذہن انسانی پر یہ امر بھی آشکار کر دیا جائے کہ کائنات خلقت اور اس کی ہر مخلوق کی بناوٹ کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ایک خاص مقصد کے تحت ایک خاص نظام و قانون میں باہمد گر منسلک ہے اور کوئی چیز نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹۔۴۴)

اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور بلاشبہ اس بات میں ارباب ایمان کے لیے (معرفت حق کی) ایک بڑی سی نشانی ہے۔

ربنّا ما خلقت ھٰذا باطلا (۳۵ کو۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار یہ سب کچھ تو نے اس لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ محض ایک بیکار و عبث سا کام ہو۔

تخلیق کے اس مقصدی پہلو کو مولانا آزاد نے ”تخلیق بالحق“ سے تعبیر کیا ہے ۔ ”بالحق“ کا لفظ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے جس کا مقصد اس بات پر توجہ دلانا ہے کہ کائنات ہستی کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں زندگی کے لیے افادہ و فیضان نہ ہو فطرت خود یہ چاہتی ہے کہ جو کچھ وہ بنائے اس طرح بنائے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع و راحت ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ج یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ط کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۳۹۔۵)

اس نے آسمانوں اور زمینوں کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس نے رات

دن کے اختلافات اور ظہور کا ایسا انتظام کر دیا کہ رات دن پر لپٹی جاتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے اور سورج چاند دونوں کو اس کی قدرت نے مسخر کر رکھا ہے سب اپنی اپنی جگہ اپنے مقررہ وقت تک کے لیے گردش کر رہے ہیں۔

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابِ مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّابِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ٥(۱۰:۵)

وہ کارفرمائے قدرت جس نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو روشن بنایا اور پھر چاند کی گردش کے لیے منزلیں ٹھہرادیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اوقات کا حساب معلوم کرلو بلاشبہ اللہ نے یہ سب کچھ پیدا نہیں کیا ہے۔ مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ وہ ان تمام لوگوں کے لیے جو جاننے والے ہیں علم و معرفت کی نشانیاں الگ الگ کر کے واضح کر دیتا ہے۔

فطرت کے جمال و زیبائی کے لیے بھی یہی "بالحق" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی کائنات میں تحسین و آرائش کا قانون کام کر رہا ہے جو چاہتا ہے کہ جو کچھ بنے اس میں حسن و جمال اور خوبی و کمال ہو۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ (۶۴-۳)

اس نے آسمانوں کو اور زمینوں کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسن و خوبی سے بنائیں۔

اسی لیے وہ قانون مجازات پر (یعنی جزا و سزا کے قانون پر) اسی تخلیق بالحق سے استشہاد کرتا ہے۔ دنیا میں ہر چیز کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے جو اپنے عمل سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرتی ہے اور یہ تمام خواص و نتائج لازمی اور اٹل ہیں پھر کیونکر ممکن ہے کہ انسانی اعمال میں بھی اچھے اور برے خواص نہ ہوں۔ اور ان کے ویسے وہی نتائج برآمد نہ ہوں جو قانون فطرت دنیا کی ہر چیز میں اچھے برے کا امتیاز رکھتا ہے وہ انسان کے اعمال میں امتیاز سے

غافل ہو جائے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۴۵: ۲۱:۲۲)

جولوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ یعنی دونوں برابر ہو جائیں زندگی میں بھی اور موت میں بھی اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو کیا ہی برا ان کا فیصلہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہر جان اپنی کمائی کے مطابق بدلہ پالے اور ایسا نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو۔

معاد یا مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی اسی ''تخلیق بالحق'' سے استشہا کیا گیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہٰی رکھتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہی ہو اور یہ منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ کائنات ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اسی لیے پیدا ہو اور چند دن جی کر فنا ہو جائے۔

اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (۳۰۔۸)

کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو اصل بات یہ ہے کہ

انسانوں میں بہت لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

ربوبیت۔توحید پر استدلال:

اس موقع پر یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ قرآن نے مظاہر کائنات کے جن مقاصد و مصالح سے استدلال کیا ہے ان میں سب سے زیادہ عام استدلال ربوبیت کا استدلال ہے مثلاً توحید باری کے تعلق سے اس کا استدلال یہ ہے کہ کائنات کے تمام اعمال ومظاہر کا اس طرح واقع ہونا کہ ہر چیز پرورش کرنے والی اور پر تاثیر زندگی بخشنے والی ہے اور پھر ایک ایسے نظام ربوبیت کا موجود ہونا جو ہر حالت کی رعایت کرتا اور ہر طرح کی مناسبت ملحوظ رکھتا ہے ہر انسان کو وجدانی طور پر یقین دلاتا ہے کہ ایک ہستی موجود ہے جو ساری کائنات کو زندگی بخشتی ہے اور تمام مخلوقات کی پرورش کرتی ہے اور اسی لیے ایسی تمام صفات سے متصف ہے جس کی جلوہ آرائی کے بغیر نظام کائنات کا ایسا کامل اور بے عیب کارخانہ ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔

وہ سوال کرتا ہے کہ انسانی وجدان یہ باور کرسکتا ہے کہ نظام حیات کا یہ کارخانہ خود بخود عالم وجود میں آ گیا ہے اور کوئی ارادہ کوئی حکمت اس کے اندر کارفرما نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کارخانہ وجود کا کوئی کارساز نہ ہو۔ کیا یہ پورا نظام حیات محض ایک اندھی بہری قوت بے جان مادے اور بے حس الکٹرون کا مظہر ہے اور عقل وارادہ رکھنے والی کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔

اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگاری اور کارسازی کا عمل تو ہر جگہ موجود ہے۔ مگر کوئی پروردگار اور کارساز موجود نہیں نظم موجود ہے۔ مگر ناظم موجود نہیں رحمت موجود ہے مگر کوئی رحیم موجود نہیں یعنی سب کچھ موجود ہے مگر کوئی موجود نہیں انسان کی فطرت مشکل ہی سے یہ باور کرسکتی ہے کہ عمل بغیر کسی عامل کے نظم بغیر کسی ناظم کے قیام بغیر کسی

قیوم کے عمارت بغیر کسی معمار کے نقش بغیر نقاش کے یعنی سب کچھ بغیر کسی موجود کے ظہور پذیر ہوسکتا ہے اس کا وجدان پکار اُٹھتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں اس کی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچہ لے کر آئی ہے جس میں یقین وایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ اس میں سمائی نہیں ہوسکتی ہے۔

قرآن کہتا ہے یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ وہ نظام کائنات کا مطالعہ کرے اور ایک ایسی ہستی کا یقین جو رب العٰلمین ہے۔ اس کے اندر جاگ نہ اٹھے وہ کہتا ہے کہ غفلت کی سرشاری اور سرکشی کے ہیجان میں انسان ہر چیز کا منکر ہوسکتا ہے لیکن اپنی فطرت سے انکار نہیں کرسکتا وہ ہر چیز کے خلاف جنگ کرسکتا ہے لیکن اپنی فطرت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکتا وہ جب اپنے چاروں طرف زندگی اور پروردگاری کا ایک عالمگیر کارخانہ پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی اپنی فطرت اس کا اندرون صدا دیتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے ضرور کوئی نہ کوئی اس کا بنانے والا اور پیدا کرنے والا بھی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا اسلوب بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلمات کی شکلیں ترتیب دے اور پھر ان پر دلیل وبرہان کی عمارتیں اٹھائے بلکہ وہ انسان کے فطری وجدان وذوق سے مخاطب ہوتا ہے وہ کہتا ہے خدا پرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلائل پیش کیے جائیں لیکن یہ دلائل ایسے نہیں ہونے چاہئیں۔ جو محض ذہنی کاوشوں کا مظہر ہوں، بلکہ ایسے ہونے چاہئیں جو اس کے نہاں خانہ دل پر دستک دیں اور اس کے فطری وجدان کو بیدار کردیں۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہوگیا تو پھر اثبات ایمان کے لیے بحث ودلیل کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے گی بلکہ خود بخود ایمان کی روح اس کے اندر جاگ اُٹھے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حُجت لاتا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۰ : ۳۱:۳۲)

وہ کون ہے جو آسمان میں پھیلے ہوئے کارخانہ حیات سے اور زمین کی وسعت میں پیدا ہونے والے سامان رزق سے تمہیں روزی بخش رہا ہے وہ کون ہے جس کے قبضے میں تمہارا سننا اور دیکھنا ہے وہ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے پھر وہ کون سی ہستی ہے جو یہ تمام کارخانہ خلقت اس نظم و نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے؟ (اے پیغمبر) یقیناً وہ بے اختیار بول اُٹھیں گے اللہ ہے (اس کے سوا کون ہوسکتا ہے)

اچھا تم ان سے کہو جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں تو پھر کیوں ایسا ہے کہ غفلت و سرکشی سے نہیں بچتے ہاں بے شک یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے۔ افسوس تمہاری سمجھ پر) تم حقیقت سے منہ پھرائے کہاں جا رہے ہو۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن پوچھتا ہے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ○ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ

الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۷. ۶۰ تا ۶۴)

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے تمہارے لیے پانی برسایا پھر اس آب پاشی سے خوشنما باغ اُگائے حالانکہ تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ ان باغوں کے درخت اگاتے؟ کیا (ان کاموں کا کرنے والا) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے (افسوس ان لوگوں کی سمجھ پر کہ حقیقت حال کتنی ہی ظاہر ہو مگر یہ وہ لوگ ہیں جن کا شیوہ ہی کج روی ہے اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جس نے زمین کو زندگی و معیشت کا ٹھکانہ بنا دیا اس کے درمیان نہریں جاری کر دیں اس کی (درستگی کے لیے) پہاڑ بلند کر دیئے اور دریاؤں میں یعنی دریا اور سمندر میں ایسی دیوار حائل کر دی (کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محدود رہتے ہیں) کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے؟ افسوس کتنی واضح بات ہے مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو بے قراروں کی پکار سنتا ہے جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اسے پکارنے لگتے ہیں اور ان کا درد دکھ ٹال دیتا ہے؟ اور یہ کہ اس نے تمہیں زمین کا جانشین بنایا کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے (افسوس تمہاری غفلت پر) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو اچھا بتلاؤ کون ہے جو صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے وہ کون ہے جو باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے۔ (ہرگز نہیں) اللہ کی ذات اس ساجھے سے پاک ومنزہ ہے جو لوگ اس کی معبودیت میں ٹھہرا رہے ہیں اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے اور پھر اسے ڈھاتا ہے اور وہ کون ہے جو آسمان زمین کے کارخانہ

سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے (اے پیغمبران سے کہو اگر تم (اپنے رویہ میں) سچے ہو اور انسانی عقل و بصیرت کی اس عالمگیر شہادت کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔

ان سوالات میں سے ہر سوال اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے "وہ فطرت انسانی کا ایک عالمگیر اور مسلمہ اذعان ہے۔ قرآن کے وہ بے شمار مقامات جن میں کائنات ہستی کے سروسامان پرورش اور نظام ربوبیت کی کارسازیوں کا ذکر کیا گیا ہے دراصل قرآنی استدلال کی بنیاد ہیں اور اسی سے توحید الٰہی کی تائید ہوتی ہے۔"

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا ۝ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّ فَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (۸۰-۲۴تا۳۲)

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے جو روز و شب اس کے استعمال میں آتی ہے۔ ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں۔ پھر اس کی سطح شق کر دیتے ہیں پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں اناج کے دانے، انگور کی بیلیں کھجور کے خوشے (سبزی ترکاری) زیتون کا تیل درختوں کے جھنڈ اور قسم قسم کے میوے طرح طرح کا چارہ اور یہ سب کچھ کس کے لیے تمہارے فائدے کے لیے اور تمہارے جانوروں کے لیے۔

ان آیات میں "فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ" کے زور پر غور کرو، انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور حقائق زندگی سے کتنا ہی اعراض کرے لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتیں، ایک انسان دنیا کے تمام مظاہر کی طرف سے آنکھیں بند کر لے لیکن اپنی غذا کے ذرائع کی طرف سے بہر

حال آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو غذا اس کے سامنے رکھی ہے اس پر نظر ڈالے یہ کیا ہے؟ گیہوں کا ایک دانہ اچھا گیہوں کا ایک دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام مرحلوں پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا دانہ بھی وجود میں آ سکتا تھا اگر تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا اور اگر دنیا میں ایسا باقاعدہ نظام اشتراکیت موجود ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا ناظم اور کارفرما نہ ہو۔

سورہ نحل میں یہی استدلال ایک دوسرے پیرایہ میں نمودار ہوا ہے:

وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (١٦ : ٦٦ : ٦٧)

اور دیکھو یہ چارپائے (جنہیں تم پالتے ہو) ان میں تمہارے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی بڑی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون و کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بے غل و غش مشروب ہوتا ہے (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو، بلاشبہ اس بات میں ارباب عقل کے لیے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی نشانی ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِہَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۝ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (١٦: ٦٨:٦٩)

اور پھر دیکھو تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ

پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹہنیوں میں جو اس غرض کے لیے بلند کر دی جاتی ہیں اپنے لیے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبراری کے ساتھ گامزن ہو جائے (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے شکم سے مختلف رنگتوں کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لیے شفا ہے بلا شبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے شفاء ہے بلا شبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی بڑی نشانی ہے)

جس طرح قرآن نے وجود خالق کے ثبوت میں جا بجا خلقت سے استدلال کیا ہے اسی طرح وہ نظام حیات اور تخلیق کائنات کے احوال سے ربوبیت کا بھی استدلال کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز مربوب ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی رب بھی ہو اور دنیا میں ربوبیت کامل اور بے داغ ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ رب کامل اور بے داغ ہو۔

زیادہ واضح لفظوں میں اسے یوں ادا کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں ہر چیز ایسی ہے کہ اسے پرورش کی احتیاج ہے اور اس کی پرورش کے سامان مہیا ہیں بس ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا بھی موجود ہو یہ پرورش کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود محتاج پرورش ہو قرآن کی مندرجہ ذیل آیات اس استدلال پر مبنی ہیں۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶:۶۳-۷۳)

اچھا تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کاشت کاری کرتے ہوا سے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اسے چُورا چُورا کر دیں تو تم صرف یہ کہنے کے لیے رہ جاؤ کہ افسوس ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی دینا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں سے ہی محروم ہو گئے۔ اچھا تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ پانی جو تمہارے پینے میں آتا ہے اسے کون برساتا ہے اگر ہم چاہیں تو اسے (سمندر کے پانی کی طرح) کڑوا کر دیں پھر کیا اس نعمت کے لیے ضروری نہیں کہ تم شکر گزار ہو؟ اچھا تم نے یہ بات بھی دیکھی کہ یہ آگ جو تم سلگاتے ہو تو اس کے لیے لکڑی تم نے پیدا کی یا ہم پیدا کر رہے ہیں۔

ربوبیت۔ وجود معاد پر استدلال:

اسی طرح وہ تخلیق بالحق سے معاد یا حیات بعد الممات پر بھی استدلال کرتا ہے یہی وہ منزل ہے جس کی طرف پورا کارواں ہستی چلا جا رہا ہے کیونکر ممکن ہے کہ انسان کو محض اس لیے بنایا گیا ہو کہ وہ چند روز زندہ رہے پھر سرتا سر نیست و نابود ہو جائے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان کرہ ارض کی بہترین مخلوق ہے اور جس کی جسمانی اور معنوی نشو ونما کے لیے فطرت کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے وہ کوئی بہتر استعمال اور بلند تر مقصد نہ رکھتا ہو؟ خالق کائنات نے جب ہر چیز کو ایک خاص غرض و غایت کے لیے تخلیق کیا ہے تو کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بہترین مربوب یعنی انسان کو محض اس لیے بنایا ہو کہ مہمل اور بے نتیجہ چھوڑ دے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (۲۳: ۱۱۵:۱۱۶)

کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں بغیر کسی مقصد و نتیجہ کے پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟ اللہ جو اس کائنات ہستی کا حقیقی حکمران ہے اس سے بلند

ہے کہ ایک بیکار و عبث فعل کرے کوئی معبود نہیں ہے مگر وہ جو (جہانداری کے) عرش بزرگ کا پروردگار ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ إِلَّا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ (۳۰: ۸)

کیا ان لوگوں نے اپنے دل میں کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے محض بیکار و عبث نہیں بنایا ہے ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہو اور اس کے لیے ایک مقررہ وقت ٹھہرا دیا ہو۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروردگار کی ملاقات سے یک قلم منکر ہیں۔

یہاں تک ہم نے یہ بات اسی سادہ طریقے پر بیان کردی جو قرآن کے بیان و خطاب کا طریقہ ہے لیکن اس مطلب کو علمی بحث و گفتگو کے پیرائے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وجود انسان کرہ ارضی کے سلسلہ خلقت کی آخری اور اعلیٰ ترین کڑی ہے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ اگر پیدائش حیات سے لے کر انسانی وجود کی تکمیل تک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک ناقابل شمار مدت کے مسلسل نشو و ارتقا کی تاریخ ہوگی۔

گویا فطرت نے لاکھوں کروڑوں برس کی کارفرمائی و صناعی سے کرۂ ارض پر جو اعلیٰ ترین وجود تیار کیا ہے۔ وہ انسان ہے ماضی کے لیے اس نقطہ بعید کا تصور کرو، جب ہمارا یہ کرۂ سورج کے ملتہب کرہ سے الگ ہوا تھا۔ نہیں معلوم کتنی مدت اس کے ٹھنڈے اور معتدل ہونے میں گزر گئی۔ اور یہ اس قابل ہوا کہ زندگی کے عناصر اس میں نشو و نما پا سکیں اس کے بعد وہ وقت آیا جب اس کی سطح پر نشو و نما کی سب سے پہلی داغ بیل پڑی اور پھر نہیں معلوم کتنی مدت کے بعد زندگی کا وہ اولین تخم وجود میں آ سکا جسے پروٹو پلازم (PROTOPLASM) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، پھر حیات عضوی کی نشو و نما کا دور شروع ہوا

اور نہیں معلوم کتنی مدت اس پر گزر گئی۔ کہ اس دور نے بسیط سے مرکب تک اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی کی منزلیں طے کیں یہاں تک کہ حیوانات کی ابتدائی کڑیاں ظہور میں آئیں اور پھر لاکھوں برس اس میں نکل گئے کہ یہ سلسلہ وجود انسانی تک مرتفع ہوا۔ پھر انسان کے جسمانی ظہور کے بعد اس کے ذہنی ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا اور بالآخر ہزاروں برس کے اجتماعی اور ذہنی ارتقاء کے بعد وہ انسان ظہور پذیر ہو سکا جو کرہ ارضی کے تاریخی عہد کا عقیل اور متمدن انسان ہے گویا زمین کی پیدائش سے لے کر ترقی یافتہ انسان کی تکمیل تک جو کچھ گزرتا ہے اور جو کچھ بنتا سنورتا ہے وہ تمام انسان کی پیدائش و تکمیل ہی کی سرگزشت ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس وجود کی پیدائش کے لیے فطرت نے اس درجہ اہتمام کیا ہے کیا یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے اور مرکز فنا ہو جائے قدرتی طور پر اس سلسلہ میں ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر وجود انسانی اپنے ماضی میں ہمیشہ کے لیے یکے بعد دیگرے متغیر ہوتا تا کہ ماضی میں بے شمار صورتیں مٹیں اور یکے بعد دیگرے نئی زندگیاں ظہور میں آئیں تو اس بات پر کیوں تعجب ہو۔ کہ انسان کی موجودہ زندگی کا مٹنا بھی بالکل مٹ جانا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی ایک اعلیٰ تر شکل اور زندگی ہے۔

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى ۞ اَلَمۡ يَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِيٍّ يُّمۡنٰى ۞ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى (۷۵: ۳۶:۳۸)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہ ہوگی کیا اس پر یہ حالت نہیں گزر چکی کہ پیدائش سے پہلے نطفہ تھا پھر نطفہ سے علقہ ہوا (یعنی جونک کی شکل ہوگئی) پھر علقہ سے (اس کا ڈیل ڈول) پیدا کیا گیا پھر (اس ڈیل ڈول کو) ٹھیک ٹھیک درست کیا۔

لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (۸۴۔۱۹) : کہ تم کو درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت

پر پہنچتا ہے۔

ربوبیت۔ وحی پر استدلال:

اسی طرح قرآن نظام ربوبیت یا رحمت الٰہی کے اعمال سے نیکی اور بدی کے ان قوانین پر بھی استدلال کرتا ہے جو حیات انسانی میں کارفرما ہیں اور وحی و رسالت کی دلیل بھی پیش کرتا ہے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ جس رب العالمین نے ہر چیز کی جسمانی نشو و نما کے لیے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس نے روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون قاعدہ مقرر نہ کیا ہو جس سے انسان کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل ہے۔ حٰمٓ ۝

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۳۹: ۱)

یہ اللہ کی طرف سے کتاب (ہدایت) نازل کی جاتی ہے جو عزیز اور حکیم ہے۔

قرآن بے شک ان لوگوں سے واقف ہے جو وحی الٰہی کے اصول پر شبہ کرتے ہیں۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ (۶: ۹۱)

اور اللہ کے کاموں کی انہیں جو قدر شناسی کرنی تھی یقیناً انہوں نے نہیں کیا جب انہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔

اس کے لیے قرآن جسمانی دنیا کی تمثیل پیش کرتا ہے کہ جس طرح انسان کی جسمانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے اسی طرح اس کی روحانی ہدایت کے لیے بھی سرو سامان مہیا کیا گیا۔ ربوبیت الٰہی خدا کی تخلیقی سرگرمیوں کا ایک مظہر ہے جو اس کی صفت رحمت پر دلالت کرتا ہے جس کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات کو اگلے باب میں بیان کیا گیا ہے۔

باب سوم

صفت رحمت

(پہلا حصہ رحمت الٰہی)

ربوبیت الٰہی کا نظام جس پر گذشتہ باب میں روشنی ڈالی گئی ہے زندگی کی ایک جاذب توجہ حقیقت ہے لیکن مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں ربوبیت الٰہی سے بھی زیادہ وسیع حقیقت کارفرما ہے جس پر خود ربوبیت کا انحصار ہے۔قرآن اسے رحمت یا رحمانیت یا رحیمیت سے تعبیر کرتا ہے۔ جو ہر مخلوق کو جمال و تکمیل عطا کرتی ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (۷۔۱۵۶) اور میری رحمت دنیا کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

قرآن کی پہلی سورۂ فاتحہ کی دوسری آیت میں رحمت کے تصور کو واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ سورۂ فاتحہ کے سرعنوان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی میں اس تصور کی نقش آرائی کر دی گئی ہے اس میں الرحمٰن اور الرحیم کے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں دونوں کا مادہ رحمت ہے عربی میں رحمت کے معنی ہیں ایسی رقت و نرمی جس سے کسی دوسرے کے لیے شفقت کا اظہار ہو پس رحمت میں محبت شفقت فضل اور احسان سب کا مفہوم داخل ہے "الرحمٰن" کے معنی ہیں۔ جس میں رحمت ہے اور الرحیم کا مفہوم ہے ایسی ذات میں نہ صرف رحمت ہے

بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے یا ایسی ہستی جس سے کائنات خلقت کی ہر شے ہر لحہ فیضیاب ہوتی رہتی ہے ان دونوں حیثیتوں کو ایک ساتھ واضح کرنے میں قرآن کا مقصد یہ ہے کہ رحمت الٰہی کی ہمہ گیری کو واضح کیا جائے ربوبیت کی شان مخلوق کی پرورش ہے لیکن صرف پرورش ہی زندگی کا منتہیٰ نہیں ہے۔اس پورے کارخانہ ہستی کی تخلیق بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اگر اس کے ہر عمل میں بتدریج بناؤ اور سنوار کا خاتمہ نہ ہوتا فلسفہ کہتا ہے کہ فطرت کا منشا اور مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ بنائے سنوارے اور نکھارے ۔ بناؤ کا مزاج اعتدال چاہتا ہے اور حسن تناسب کا متقاضی ہوتا ہے اور اعتدال و تناسب دنیا کے تمام تعمیری حقائق کی اصل ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کائنات میں صرف تعمیر کی ضرورت کیوں ہے محض ہم آہنگی کیوں ہے انحراف وتجاوز کیوں نہیں؟ فلسفہ ان سوالات کا جواب نہ دے سکا ایک مشہور فلسفی کا قول ہے کہ جس مقام سے ''یہ کیوں'' شروع ہوتا ہے فلسفہ کی سرحد ختم ہو جاتی ہے لیکن قرآن اس کا جواب دیتا ہے وہ کہتا ہے یہ ضرورت رحمت الٰہی کی ضرورت ہے رحمت الٰہی چاہتی ہے کہ جو کچھ ظہور میں آئے وہ جمیل وزیبا ہو اور اسی لیے ایسا ہوتا ہے قرآن سوال کرتا ہے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ(۶:۱۲)

آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ کس کے لیے ہے؟(اے پیغمبر) کہہ دے کہ اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے لیے ضروری ٹھہرالیا ہے کہ رحمت ہو۔

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے قرآن کی متعدد آیات پیش کی ہیں جن میں اس امر پر زور دیا گیا کہ کائنات ہستی کے ہر ذرہ میں حسن خوبی ہے اور یہ تمام کارگاہ عالم اسی لیے بنا ہے کہ انسان کو اس سے فائدہ پہنچے اس آیت قرآنی میں اسی صداقت کو بیان کیا گیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵:۱۳)

اور آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دے دی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو) بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور کرنے والے ہیں اس بات میں (معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی میں رحمت الٰہی کا نظام کچھ اس طرح کارفرما ہے کہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر نفع پہنچاتا ہے اگر ایک عالی شان محل میں رہنے والا انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تمام کارخانہ ہستی اسی کی کاربرآریوں کے لیے ہے تو ٹھیک اسی طرح ایک چیونٹی بھی یہ کہہ سکتی ہے کہ فطرت کی ساری کارفرمائیاں صرف اسی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہیں اور کون ہے جو اس بات سے انکار کر سکتا ہے۔ کیا فی الحقیقت سورج اس لیے نہیں ہے کہ چیونٹی کو حرارت پہنچائے کیا بارش اس لیے نہیں ہے کہ اس کے واسطے رطوبت مہیا کرے اور ہوا اس لیے نہیں ہے کہ اس کی ناک تک شکر کی بو پہنچائے؟ کیا زمین اس کے لیے ہر موسم کے مطابق مقام و پناہ گاہ فراہم نہیں کرتی؟ دراصل فطرت کی بخشائیوں کا قانون کچھ ایسا عام اور ہمہ گیر واقع ہوا ہے کہ بیک وقت ہر مخلوق کو یکساں طور پر فائدہ پہنچاتا ہے۔

وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَآئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ○

اور زمین کے تمام جانور اور (پردار) بازوؤں سے اڑنے والے تمام پرند دراصل تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔

تخریب و تعمیر:

البتہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دنیا عالم کون فساد ہے، یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑتا ہے اور ہر بکھرنے کے ساتھ سمٹتا ہے جس طرح سنگ تراش کا پتھر کو

توڑنا پھوڑنا اس لیے ہوتا کہ کہ خوبی ودلآویزی کا ایک پیکر تیار کردے۔ اسی طرح کائنات عالم کا تمام بگاڑ بھی اسی لیے ہے کہ بناؤ اور خوبی کا فیضان ظہور میں آئے فطرت اسی نہج سے ہستی کی عمارت کا ایک ایک گوشہ تیار کرتی رہتی ہے وہ پوری احتیاط وتوجہ کے ساتھ اس کارخانہ کا ایک ایک کیل پرزہ ڈھالتی رہتی ہے۔ اور حسن وخوبی کی حفاظت کے لیے ہر رکاوٹ کا مقابلہ اور ہر نقصان کا ازالہ کرتی رہتی ہے، تعمیر وتکمیل کی یہی سرگرمیاں ہیں جو بظاہر تخریب وتباہی کی ہولناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ ہستی میں تخریب کہاں ہے جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے وہ تعمیری کا ثبوت ہے۔ سمندروں میں طوفان۔ دریاؤں میں طغیانیان پہاڑوں میں آتش فشانی، جاڑوں میں برف باری، گرمیوں میں بادسموم۔ بارش میں ہنگامہ ابر وباد وبرق ورعد یہ سب اگرچہ بظاہر خوش آئند نہیں ہوتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں ہر حادثہ کائنات ہستی کی تعمیر وورنگی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر کوئی مفید سے مفید چیز تمہاری نظر میں ہوسکتی ہے اگر سمندروں میں طوفان نہ اُٹھتے تو میدانوں کو بارش کا ایک قطرہ بھی میسر نہ آتا۔ اگر بادلوں میں گرج کڑک نہ ہوتی تو باراں رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا ۔ اگر آتش فشاں پہاڑوں کی چوٹیاں نہ پھٹتیں تو زمین کے اندر کا کھولتا ہوا لاوا اس کرہ ارض کی تمام سطح کو پارہ پارہ کر دیتا اور اس کے اوپر پھیل جاتا، تم پوچھ بیٹھو گے۔ کہ زمین کے اندر یہ کھولتا ہوا لاوہ پیدا ہی کیوں کیا گیا۔

لیکن تمہیں جاننا چاہیے کہ اگر یہ مادہ نہ ہوتا تو زمین کی قوت نشو ونما کا ضروری عنصر مفقود ہو جاتا یہی وہ حقیقت ہے جس کی جانب قرآن نے جابجا اشارے کیے ہیں ۔ مثلاً قرآن کہتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ (۳۰:۲۴)

اور دیکھو، اس کی قدرت وحکمت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھتی ہے۔ بلاشبہ اس صورت حال میں ان لوگوں کے لیے جو عقل وبینش رکھتے ہیں۔ حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

جمالِ فطرت:

قرآن کہتا ہے کہ فطرت کی سب سے بڑی بخشائش اس کا عالمگیر حسن و جمال ہے جو رحمت الٰہی کا عکس ہے۔ فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں بلکہ وہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کا ہر نقش نظر افروز ہوتا ہے۔ دراصل کائنات ہستی کا مایہ خمیر ہی حسن وزیبائی ہے، فطرت نے جس طرح اس کے بناؤ کے لیے عناصر پیدا کیے اسی طرح چہرہ وجود کی آرائش وزیبائش کے لیے روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ کی تخلیق کی۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ

(۳۲ :۶-۷)

بلاشبہ ہم کائنات ہستی میں خوبی ودلربائی کے پہلو بہ پہلو زشتی وبدصورتی کے مظاہر بھی پاتے ہیں، بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ ساتھ زاغ وزغن کا شور وغوغا بھی ہم سنتے ہیں، ساز فطرت کے تاروں میں اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں اور کائنات ہستی میں تناسب وہم آہنگی کا یہی قانون کارفرما ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۱۷ :۴۴)

ساتوں آسمانوں اور زمین اور جو کوئی بھی ان میں ہے سب اپنی بناوٹ کی خوبی اور صفت کے کمال میں اللہ کی بڑائی اور پاکی کا (زبان حال ہے) اعتراف کر رہے ہیں اور اتنا نہیں (بلکہ کائنات خلقت میں) کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو (زبان حال سے) اس کی تسبیح و تحمید نہ کر رہی ہو مگر (افسوس کہ) تم (اپنے جہل و غفلت سے) اس ترانہ تسبیح کو سمجھتے نہیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی بردبار (اور) بڑا ہی بخش دینے والا ہے۔

قرآن کہتا ہے حسن عبارت ہے تناسب و موزونیت سے اور ہر وجود کو یہ خوبی عطا کی گئی ہے اور اس کی ساخت و ترکیب میں کوئی نقص نہیں ہے۔

فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ (۱۴:۲۳)

پس کیا ہی با برکت ذات ہے اللہ کی بنانے والوں میں سب سے زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ بنانے والا۔

الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ○ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیۡرٌ ○ (۶۷: ۴:۳)

اس نے تہ بہ تہ سات آسمان پیدا کیے تو (خدائے) رحمٰن کی اس صنعت میں کچھ نقص نہ دیکھے گا، پھر آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے پھر دوبارہ (اچھی طرح) دیکھ (نتیجہ یہ ہوگا) کہ ہر بار نظر ناکام ہو کر اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

اس آیت میں خدائے رحمان کی کاریگری کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر چیز ایک ایسی ہستی کی پیدا کی ہوئی ہے جو صرف خالق ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی خدائے رحمت بھی ہے اور جہاں رحمت کی کارفرمائی ہوگی وہاں جمال و تکمیل کی جلوہ گری بھی ہوگی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ زندگی میں رحمت کی کارفرمائی نہ صرف یہ کہ توحید الٰہی کی شہادت ہے

بلکہ وحی اور معاد کا بھی اس سے ثبوت ملتا ہے۔

زندگی کی ہماہمی:

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی میں جو سرگرمی اور ہماہمی نظر آتی ہے وہ رحمت الٰہی کا ایک جلوہ ہے وہ کہتے ہیں کہ کائنات ہستی کے ہر میدان اور ہر گوشے میں جہد حیات کا جلوہ نظر آتا ہے اور زندگی بحیثیت مجموعی ایک آزمائش ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ (۹۰:۴)

بلاشبہ ہم نے انسان کو اس طرح بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے۔

تاہم فطرت نے کارخانہ معیشت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا بنا دیا ہے اور طبیعتوں میں کچھ اس طرح کے جذبے اور ولولے ودیعت کر دیے ہیں کہ انسان اپنے آپ کو پورے انہماک کے ساتھ کسی نہ کسی مشغولیت اور سرگرمی میں مصروف رکھتا ہے اور زندگی کا یہی انہماک ہے۔ جس کی بدولت وہ نہ صرف زندگی کی مشقتیں برداشت کرتا ہے بلکہ انہیں مشقتوں سے اپنی راحت و مسرت کے سامان مہیا کر لیتا ہے یہ مشقتیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں زندگی کی دلچسپی اور محبوبیت بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے اگر انسان کی زندگی ان آزمائشوں سے خالی ہو جائے تو وہ محسوس کرے گا کہ زندگی کی ساری لذتوں سے محروم ہو گیا ہے اور اب زندہ رہنا اس کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے مولانا آزاد نے مختلف النوع انسانی تجربات اور فطرت کے اختلاف و تنوع سے اس بات کا اشہاد کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ بالخصوص قانون تزویج یا اصول تثنیہ یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور اسے سرگرمی حیات کی معاون قوت قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں کوئی چیز اکہری اور طاق نہیں پیدا کی گئی ہے۔ ہر چیز میں جفت اور دو ہونے کی قوت کام کر رہی ہے۔ یعنی ہر چیز دوسری چیز سے مل کر مکمل ہوتی ہے دن کے لیے رات ہے۔ صبح کے لیے شام ہے

نر کے لیے مادہ ہے مرد کے لیے عورت ہے اور زندگی کے لیے موت ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۵۱:۴۹)

اور ہر چیز میں ہم نے پیدا کر دیے یعنی دو اور متقابل اشیاء پیدا کیں تا کہ تم یاد کرو۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶:۳۶)

پاکی اور بزرگی ہے اس ذات کے لیے جس نے زمین کی پیداوار میں اور انسان میں اور ان تمام مخلوقات میں جن کا انسان کو علم نہیں دو دو اور متقابل چیزیں پیدا کیں۔

یہی قانون فطرت ہے جس نے مرد اور عورت میں جذب و انجذاب کے ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیے ہیں کہ اس کی بدولت ازدواجی زندگی کے ضروری تقاضوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا (۴۲: ۱۱)

وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس میں جوڑے بنا دیے یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد اسی طرح چارپایوں میں بھی جوڑے پیدا کر دیے۔

قرآن کہتا ہے یہ انتظام اس لیے ہے کہ محبت اور سکون میں اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت و اشتراک سے زندگی کی محنتیں سہل اور گوارا ہو جائیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰: ۲۱)

اور دیکھو اس کی رحمت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں

سے جوڑے پیدا کر دیئے (یعنی مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد) تا کہ اس کی وجہ سے تمہیں سکون حاصل ہو۔ اور پھر اس کی یہ کارروائی دیکھو) تمہارے درمیان (یعنی مرد اور عورت کے درمیان محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں اس میں حکمت الٰہی کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

بقائے انفع:

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ کائنات ہستی کا یہ حسن اور یہ ارتقاء زیادہ مدت تک قائم ہی نہیں رہ سکتا تھا اگر اس میں خوبی کی بقا اور خرابی کے ازالے کی قوت سرگرم نہ رہتی فطرت ہمیشہ فساد و نقص کو محو کرتی رہتی ہے اور جن چیزوں میں باقی رہنے کی خوبی ہوتی ہے انہیں باقی رکھتی ہے عام اصطلاح میں اسے بقائے انفع سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآن محض اشیا کے مادی پہلو پر ہی نہیں بلکہ زندگی میں ان کی عام افادیت پر بھی زور دیتا ہے قرآن کہتا ہے کہ اس کارگاہ ہستی میں وہی چیز باقی رہتی ہے جس میں حیات کے لیے کچھ نہ کچھ افادہ و فیضان ہو۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ (۱۳:۱۷)

خدا نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جس قدر سمائی تھی اس کے مطابق بہہ نکلے جس قدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آ گیا تھا اسے سیلاب اُٹھا کر بہا لے گیا اسی طرح جب زیور یا کسی طرح کا سامان بنانے کے لیے مختلف قسم کی دھاتیں) آگ پر تپاتے

ہیں تو اس میں بھی جھاگ اٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتی ہے اسی طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کر دیتا ہے (جھاگ رائیگاں جائے گا کیونکہ اس میں نفع نہ تھا) جس چیز میں انسان کے لیے نفع ہوگا وہ زمین میں باقی رہ جائے گی۔

قضا بالحق:

قرآن کہتا ہے کہ جس طرح کائنات ہستی کے مادی نظام میں وہی چیز باقی رہتی ہے جو نافع ہوتی ہے ٹھیک یہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے کہ وہی چیز باقی رہے گی جو نفع بخش ہو اس سلسلہ میں قرآن دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے "حق" اور "باطل" عربی میں حق کا مادہ "حقق" ہے جس کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات قائم رہنے والی اور اٹل ہو اسے حق کہیں گے اور باطل ٹھیک اس کا نقیض ہے یعنی ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو۔ پس جب کبھی حق اور باطل متقابل ہوں گے۔ تو بقاء حق کے لیے ہوگی۔ قرآن اسے قضا بالحق سے تعبیر کرتا ہے۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷: ۸۱)

اور کہہ دو حق نمودار ہو گیا اور باطل نابود ہوا اور یقیناً باطل نابود ہونے والا تھا۔

قرآن میں جہاں کہیں حق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو یہ صرف حق کے بقا و ثبات کا دعویٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے جانچنے کا ایک معیار بھی پیش کرتا ہے تاکہ آسانی سے امتیاز پیدا کیا جا سکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے کونسی چیز رہنے والی ہے اور کونسی چیز فنا ہونے والی ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کی نسبت بھی "الحق" کی صفت استعمال کرتا ہے اور وحی تنزیل کو بھی الحق کہتا ہے۔

اگر فطرت کائنات زندگی کے لیے کارآمد اور بے کار چیزوں کو چھانٹتی نہ رہتی زندگی میں ایک انتشار برپا ہو جاتا اور تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳: ۷۱)

اور اگر حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرے تو یقین کرو یہ آسمان اور زمین اور جو کوئی اس میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

لیکن قضا بالحق کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ ہر باطل عمل یا وہ چیز جس میں زندگی کے لیے نفع نہیں ہے لازمی طور پر نابود ہو جائے یا ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے ایسا عمل قانون رحمت کے مغائر ہوگا۔ جس طرح مادیات میں تدریج وامہال کا قانون نافذ ہے۔ معنویات میں بھی وہی قانون کارفرما ہے تاکہ ہر نتیجہ کے ظہور اور عمل کے مکافات کے لیے مہلت مل سکے اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلت حیات پا سکتی۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ (۱۰۔۱۱)

اور جس طرح انسان فائدہ کے لیے جلد باز ہوتا ہے اگر اسی طرح اللہ انسان کو سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو (انسان کی لغزشوں خطاؤں کا یہ حال ہے کہ کبھی کا فیصلہ ہو چکتا اور ان کا مقررہ وقت فوراً نمودار ہوتا)

تدریج وامہال:

فطرت کے یہ قوانین اس طرح اپنا کام کرتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی فوری اور ڈرامائی انداز میں اچانک تبدیلی رونما نہیں ہوتی بلکہ بتدریج ان کی نشوونما ہوتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ قرآن جہاں یہ کہتا ہے کہ جو بھی (قانون حیات) ہم نے نافذ کر دیا ہے۔ اس میں ردوبدل ممکن نہیں، وہیں یہ ارشاد بھی فرماتا ہے کہ ہم اس بنا پر انسان کو کسی نامناسب عذاب میں مبتلا نہیں کرتے (۲۸۔۵۱)

فطرت نے ہر چیز کے تدریجی عروج وزوال کے لیے ایک خاص مدت مقرر کردی ہے جس کا جلوہ صرف حیات انسانی ہی میں نہیں بلکہ ہر تخلیق میں دکھائی دیتا ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک خاص وقت یا قرآن کی زبان مین اجل کا تعین کر دیا گیا ہے جو موجودات ہستی میں سے ہر موجود کے لیے الگ الگ نوعیت رکھتا ہے۔

تدریج وامہال کا یہ قانون خاص طور پر انسانی اعمال کے لیے ہے تا کہ ہر مرحلہ پروہ توقف وتفکر سے کام لے اور قانون فطرت کی مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھائے چنانچہ توبہ ورجوع کے لئے رحمت کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے قرآن کہتا ہے کہ کارخانہ حیات میں اگر رحمت نہ ہوتی تو زندگی سے کوئی چیز بھی افادہ وفیضان حاصل نہ کرسکتی اور انسان اپنی بدعملیوں کے ساتھ کبھی زندگی کی سانس نہ لے سکتا۔

لَوْيُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ط بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًاo (۱۸: ۵۸)

اگر وہ ان لوگوں سے ان کے اعمال کے مطابق مواخذہ کرتا تو فوراً عذاب نازل ہو جاتا لیکن ان کے لیے ایک میعاد مقرر کردی گئی ہے اور جب وہ نمودار ہوگی تو اس سے بچنے کے لیے کوئی پناہ کی جگہ نہیں ملے گی۔

عمل حق اور عمل باطل دونوں کے لیے تدریج وامہال کا قانون کام کرتا ہے البتہ عمل حق کے لیے تاجیل اس واسطے ہوتی ہے کہ اس کی قوت کو تدریجی طور پر نشو ونما پانے کا موقع ملے اور باطل کے لیے اس واسطے ہوتی ہے کہ اسے توبہ ورجوع کی مہلت حاصل ہو سکے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ط وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا o (۱۷: ۲۰)

اے پیغمبر، ہم ان کو اور ان سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں اور

تمہارے پرودگار کی بخشش کسی پر بند نہیں ہے۔

اگر انسان مہلت بخشیوں سے فائدہ نہ اُٹھانا چاہتا ہے تو وہ اپنے اعمال کی اصلاح کرتا ہے اور آگے بڑھ سکتا ہے اور اس کے برعکس اگر وہ ان مواقع سے فائدہ اٹھائے تو پھر فیصلہ امر کا آخری وقت آ جاتا ہے۔

فِاذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَايَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷:۳۴)

سو جب ان کا وقت مقررہ آ چکتا تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر عمل کے نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ وَ اِنْ اَدْرِىْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ط (۲۱: ۱۰۹)

پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دیں کہ تم سب کو یکساں طور پر (حقیقت حال کی) خبر دے دی اور میں نہیں جانتا اعمال بد سے جس نتیجہ کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اس کا وقت قریب ہے یا ابھی دیر ہے۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ تم اپنے اوقات شماری کے پیمانے سے قوانین فطرت کی رفتار عمل کا اندازہ لگاؤ۔ فطرت کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے کہ تمہارے معیار حساب کتاب کی بڑی سے بڑی مدت اس کے لیے ایک دن کی مدت سے زیادہ نہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَه‘ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ٥ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا وَاِلَىَّ الْمَصِيْرُ ٥ (۲۲: ۴۷:۴۸)

اور یہ لوگ عذاب کے لیے جلد بازی کر رہے ہیں (یعنی انکار و شرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر سچ مچ عذاب آنے والا ہے تو وہ کہاں ہے۔ سو یقین کرو خدا اپنے وعدہ میں کبھی خلاف کرنے والا نہیں لیکن بات یہ ہے کہ تمہارے پروردگار کا ایک دن ایسا ہوتا ہے جیسے تمہارے حساب کا ہزار برس۔ چنانچہ کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں (عرصہ دراز تک) ڈھیل دی گئی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (جب ظہور نتائج کا وقت آ گیا تو) ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا اور (ظاہر ہے کہ) لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے۔

انسان عموماً اپنے اعمال کے فوری نتائج کا متوقع رہتا ہے۔ پیغمبر کے زمانے کے عرب جو ان کے مخالف و منکر تھے اکثر انہیں یہ طعنہ دیا کرتے تھے۔ کہ اگر وہ گمراہی میں مبتلا ہیں تو انہیں فوراً اس کی سزا ملنی چاہیے، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جزائے عمل میں تاخیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توبہ و رجوع کی مہلت باقی رہے اور رحمت کا یہی قانون ہے جو اس کارخانۂ ہستی میں جاری و ساری ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ (۲۷: ۷۱-۷۳)

اور (اے پیغمبر یہ حقیقت فراموش) کہتے ہیں اگر تم (نتائج ظلم و طغیان سے ڈرانے میں) سچے ہو تو وہ بات کب ہونے والی ہے؟ اور کیوں نہیں ہو چکتی ان سے کہہ دو گھبراؤ نہیں) جس بات کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو عجب نہیں اس کا ایک حصہ بالکل قریب آ گیا ہو اور (اے پیغمبر) تمہارا پروردگار انسان کے لیے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے کہ ہر حال میں اصلاح و تلافی کی مہلت دیتا ہے) لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) بیشتر (بہت سے) ایسے ہیں کہ اس کے فضل و رحمت سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اس کی ناشکری کرتے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ط وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَايَشْعُرُوْنَ (۲۹: ۵۳)

اور یہ لوگ عذاب کی جلدی کرتے ہیں (یعنی انکار وشرارت کی راہ سے کہتے ہیں اگر واقعی عذاب آنے والا ہے تو کیوں نہیں آ چکتا؟ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر خاص وقت نہ ٹھہرا دیا گیا ہوتا تو اس طرح آئے گا) کہ یکا یک ان پر آ گرے گا اور انہیں اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ط (۱۱:۱۰۴)

اور یاد رکھو اگر ہم اس معاملہ میں تاخیر کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ایک حساب کی ہوئی مدت کے لیے اسے تاخیر میں ڈال دیں۔

قابل غور بات یہ نہیں ہے کہ کسی عمل بد کے نتیجہ کے ظہور میں کتنی مدت لگتی ہے بلکہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ آخر کار کس قسم کے انسان آبرومند ہوتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ آخر کار وہی انسان آبرومند ہوتے ہیں جو نیک عمل ہیں۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ج فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ط اِنَّهٗ لَايُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (۶:۱۳۷)

اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ دیکھو اب میرے اور تمہارے معاملہ کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے تم جو کچھ کرتے ہو اپنی جگہ کیے جاؤ اور میں بھی اپنی جگہ کام میں لگا ہوا ہوں، عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے جس کا آخر کار (کامیاب) ٹھکانا ہے بلا شبہ (یہ اس کا قانون ہے کہ) ظلم کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔

قرآن نے اس اصول کی تبلیغ کی ہے کہ ہر قسم کے فجور وفسق کی ناکامی یقینی ہے اور نیکی ونیک عملی کا آبرومند ہونا لازمی ہے۔ قرآن نے جہاں جہاں اس اصول کا ذکر کیا ہے یا اس

پر زور دیا ہے ان تمام مقامات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶) اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰۔۱۷) لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ (۱۰۔۸۱) وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۹۔۳۷) وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۔۸۶) وغیرہ اس معینہ اصول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشاد و ہدایت کا دروازہ عمداً ان پر بند کر دیا جاتا ہے اور ان درجوں میں جو انسان آتے ہیں وہ گمراہی کی زندگی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں افسوس ہے کہ قرآن کے مفسروں نے ان آیات کے مطالب اور قرآن کے اسلوب خاص سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ قرآن کے ان ارشادات کا مطلب تو یہ ہے کہ اس امر کے باوجود کہ کارخانہ حیات میں قانون مواخذہ کارفرما ہے۔ رحمت الٰہی انسان کو اصلاح حال اور رجوع وانابت کی مہلتیں دیتی ہے لیکن جب ان مہلتوں کو بھی ٹھکرا دیا جاتا ہے یعنی جب گمراہی مسلط ہو جاتی ہے تو قانون مواخذہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کو اصطلاح قرآنی میں (تمتع) کہا گیا ہے۔ یہی وہ تمتع ہے جو زندگی کی ہر حالت میں اور ہر انسان کو یکساں طور پر عطا ہوا ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۱:۴۴)

بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو ان کے آباء واجداد کو مہلت حیات سے بہرہ مند ہونے کے مواقع دیئے یہاں تک کہ (خوشحالی کی) ان پر بڑی بڑی عمریں گزر گئیں۔

اسی طرح قرآن نے جابجا مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۔۹۸) مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ (۳۶۔۴۴) فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۶۔۵۵) وغیرہ تعبیرات سے اس حقیقت پر زور دیا ہے۔

قضا بالحق اور اقوام:

جس طرح انسانی اعمال میں قضا بالحق یا بقا کا قانون کار فرما ہے

اسی طرح قوموں یا جماعتوں کے معاملہ میں بھی اس قانون کی کارفرمائی موجود ہے اور وہ ان کے عروج وزوال کے حالات کا تعین کرتا ہے قرآن کہتا ہے کہ افراد کی طرح وہ قومیں اور جماعتیں بھی جو زندگی کے لیے غیر نافع ہوتی ہیں، چھانٹ دی جاتی ہیں۔ صرف وہی اقوام اور جماعتیں ہی باقی رہتی ہیں جو مقصد حیات کی ترقی اور نشو ونما کے لیے مفید ہوتی ہیں اور قانون رحمت یہی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتو دنیا میں انسانی ظلم وطغیان کے لیے کوئی روک تھام نہ رہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ٥ (٢ : ٢٥١)

اور (دیکھو) اگر اللہ نے جماعتوں اور قوموں میں باہم دگر تزاحم پیدا نہ کر دیا ہوتا اور وہ بعض آدمیوں کے ذریعہ بعض آدمیوں کو راہ سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً زمین میں خرابی پھیل جاتی لیکن اللہ کائنات کے لیے فضل ورحمت رکھنے والا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یہی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُه‘ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (٢٢: ٤٠)

اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ اللہ بعض جماعتوں کے ذریعہ بعض جماعتوں کو ہٹاتا رہتا تو یقین کرو دنیا میں انسان کے ظلم وفساد کے لیے کوئی روک باقی نہ رہتی اور یہ تمام خانقاہیں گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اس کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے منہدم ہو کر رہ جاتیں۔

تدریج وامہال اجتماعی زندگی میں:

جس طرح فطرت کائنات کے تمام کاموں میں تدریج وامہال کا قانون کارفرما ہے اسی طرح قوموں اور جماعتوں میں بھی اس قانون کی کارفرمائی موجود ہے۔ اصلاح حال اور رجوع وانابت کا دروازہ ان کے لیے بھی ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ کیونکہ قانون رحمت کا مقتضی یہی ہے۔

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷: ۱۶۸)

اور ہم نے ایسا کیا کہ ان کے الگ الگ گروہ زمین میں پھیل گئے ان میں سے بعض تو نیک عمل تھے بعض دوسری طرح کے پھر ہم نے انہیں اچھائیوں اور برائیوں دونوں طرح کی حالتوں سے آزمایا تاکہ نافرمانی سے باز آجائیں۔

جس طرح افراد کے لیے راہ راست پر لوٹنے کی ایک خاص مدت معین کر دی ہے اسی طرح اقوام کے لیے بھی اگر راہ راست سے بھٹک گئی ہوں تو سیدھے راستے پر واپس آنے کے لیے ایک مدت مقرر کر دی ہے۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۹:۱۲۶)

یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ہم انہیں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں یعنی ان کے اعمال بد کے نتائج پیش نہ آتے ہوں) پھر بھی نہ تو توبہ کرتے ہیں نہ حالات سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

ان تمام مہلتوں کو اگر رائیگاں کر دیا جائے تو پھر قانون فطرت کے فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷:۳۴)

اور دیکھو ہر امت کے لیے ایک مقررہ وقت ہے سو جب ان کا مقررہ وقت آ چکتا ہے تو اس سے نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے نہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ٥ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۱۵: ۴۔۵)

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ (ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون کے مطابق) ایک مقررہ میعاد اس کے لیے موجود تھی کوئی امت نہ تو اپنے مقررہ وقت سے آگے بڑھ سکتی نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

چنانچہ قضاء بالحق کا یہی قانون ناپسندیدہ اور غیر نافع افراد کو چھانٹ دیتا ہے اور ان کی جگہ مقصد حیات کی تکمیل کے لیے دوسروں کو لا کھڑا کرتا ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ٥ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ٥ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ط اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۔(۶: ۱۳۱:۱۳۳)

یہ (تبلیغ و ہدایت کا تمام سلسلہ) اس لیے ہے کہ تمہارے پروردگار کا یہ شیوہ نہیں کہ بستیوں کو ظلم و ستم سے ہلاک کر دے اور بسنے والے حقیقت حال سے بے خبر ہوں (اس کا قانون تو یہ ہے کہ جیسا جس کا عمل ہے اسی کے مطابق اس کا ایک درجہ ہے اور اسی درجہ کے مطابق اچھے برے نتائج ظاہر ہوتے ہیں اور یاد رکھو جیسے کچھ کسی کے اعمال ہیں تمہارا پروردگار ان سے بے خبر نہیں ہے، تمہارا پروردگار رحمت والا بے نیاز ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں راہ سے ہٹا دے اور تمہارے بعد جسے چاہے تمہارا جانشین بنا دے اسی طرح جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اوروں کا جانشین بنا دیا ہے۔

اصلاح حال اور رجوع و انابت کی مہلت بخشی کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے رحمت

الٰہی کی حیرت انگیز کارفرمائیوں کا ذکر کیا ہے یہ ٹھیک ہے کہ قرآن نے ہر عمل کی جزاوسزا بتا دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی قرآن کا یہ ارشاد بھی ہے یہ قانون اصلاح ورجوع کے دروازے بند نہیں کرتا۔ توبہ واصلاح کی مہلتوں پر مہلتیں دی گئی ہیں۔ جوں ہی توبہ وانابت کا احساس انسان کے اندر جنبش میں آتا ہے رحمت الٰہی معاً قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اشک ندامت کا ایک ایک قطرہ بدعملیوں اور گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے کہ گویا اس کے دامن عمل پر کوئی دھبہ لگا ہی نہ تھا جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے التائب من الذنب کمن لاذنب له ' گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کے مانند ہو جاتا ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ قرآن کہتا ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ٥(۲۵: ۷۰)

ہاں مگر جس کسی نے توبہ کی اور آئندہ کے لیے نیک عمل کی راہ اختیار کی تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ اچھائیوں سے بدل دیتا ہے اور بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کریم نے رحمت الٰہی کی وسعت اور اس کی مغفرت و بخشش کی فراوانی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی سخت گناہ ہوں کیسی شدید ان کی نوعیت ہو ....اور کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں لیکن ہر اس انسان کے لیے جو اپنے گناہوں پر نادم ہو اور خلوص کے ساتھ اس کے دروازہ رحمت پر دستک دے رحمت وقبولیت اسے اپنے آغوش میں لے لے گی۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ٥(۳۹: ۵۳)

اے میرے بندو جنہوں نے بدعملیاں کر کے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے (تمہاری بدعملیاں کتنی ہی سخت اور کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں) مگر اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا۔ یقیناً وہ بڑا بخشنے والا بڑی ہی رحمت رکھنے والا ہے۔

حصہ دوم

صفت رحمت اور انسان

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے صفات الٰہی خصوصاً اس کی صفت رحمت کی طرف کیوں اس طرح توجہ مبذول کرائی ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ رحمت کی صفت خدا کی وہ صفت ہے جو اس کی تمام صفات پر حاوی ہے اور ہر ایک میں اس کا پرتو پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب پیغمبر نے ایک حدیث قدسی میں یوں دیا ہے کہ

تم اپنے اندر صفات الٰہی پیدا کرو!

اور چونکہ رحمت ایک عالمگیر صفت الٰہی ہے اس لیے انسان کی اوّلین غایت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے فکر و عمل کے ہر شعبہ میں چاہے وہ سماجی ہو یا معاشی ہو یا سیاسی، اس صفت کی جھلک پیدا کرے۔

خدا اور بندے کے درمیان رشتہ محبت:

قرآن نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (۲. ۱۶۵)

اور دیکھو، انسانوں میں کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں۔ جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳. ۳۱)

اے پیغمبر (ان لوگوں سے) کہہ دو اگر واقعی تم اللہ سے محبت رکھنے والے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کرو (میں تمہیں محبت الٰہی کی علیحدہ راہ دکھا رہا ہوں)

اگر تم نے ایسا کیا تو (صرف یہی نہیں ہوگا) کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے بلکہ خود اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا ہے۔ قرآن جا بجا اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ (۵. ۵۴)

اے پیروان دعوت ایمانی اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوت حق کو اس سے کچھ نقصان پہنچے گا)۔

عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کرے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

قرآن کہتا ہے محبت الٰہی کی راہ اس کی مخلوق کی محبت میں ہو کر گزرتی ہے جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے اسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (۲. ۱۷۷)

اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا○ (٧٦. ٨. ٩)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارا یہ کھلانا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لیے ہے ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گزاری۔

ایک حدیث قدسی میں یہی حقیقت نہایت موثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔

حدیث : ان اللّٰہ تعالٰی یقول یوم القیامۃ یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودکَ وَانت رب العالمین قال اما علمت انّ عبدی فلاناًمرض فلم تعدہ اما علمت انک لوعدتہ لوجدتنی عندہ یا ابن استطعمتک فلم تطعمنی قال یا رب و کیف اطعمک وانت رَبّ العٰلمین قال اما علمت انہ استطعمکَ عبدی فلان فلم تطعمہ اما علمت انّکَ لوِاطعَمتہ لوجدت ذالکَ عِندی یا ابن اٰدم استسقیت فلم تسقنی قال یا رب و کیف اسقیکَ و انت رب العَالِمین قال استسقاکَ عبدی فلان فلم تسقہٖ اما انک لوسقیتہ لوجدت ذالکَ عندی اخرجہ مسلم (عن ابی ھریرہؓ)

ترجمہ: قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوگیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی بندہ متعجب ہوکر کہے گا بھلا ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے اور تو رب العلمین ہے خدا فرمائے گا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہوگیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا اسی طرح خدا فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں

کھلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار دیا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تو خود پروردگار ہے، خدا فرمائے گا۔ میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو اسے پانی نہ پلایا اگر تو نے اسے پانی پلا دیتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اعمال وعبادات:

اسی طرح قرآن نے اعمال وعبادات کی جو شکل ونوعیت قرار دی ہے اخلاق وخصائل میں سے جن جن باتوں پر زور دیا ہے اور اوامر ونواہی میں جو جو اصول ومبادی ملحوظ رکھے ہیں ان سب میں بھی یہی حقیقت کام کر رہی ہے۔ قرآن نے خدا کی کسی صفت کو بھی اس کثرت کے ساتھ نہیں دھرایا ہے اور نہ ہی کوئی مطلب اس درجہ اس کے صفات میں نمایاں ہے جس قدر رحمت کا ذکر ہے۔ اگر قران کے وہ تمام مقامات جمع کیے جائیں جہاں رحمت کا ذکر کیا گیا ہے تو ایسے مقامات قرآن میں تین سو سے زیادہ ہوں گے۔ اور اگر وہ تمام مقامات بھی شامل کر لیے جائیں جہاں اگر چہ لفظ رحمت استعمال نہیں ہوا ہے۔ لیکن ان کا تعلق رحمت ہی سے ہے جیسے ربوبیت، مغفرت رافت کرم، حلم، عفو وغیرہ تو پھر یہ تعداد اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کے اول سے لے کر آخر تک اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی کا پیغام ہے پیغمبر اسلام نے اپنے قول وعمل سے جو حقیقت ہم پر واضح کی ہے (تمام تر یہی ہے کہ خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت ورحمت کی جائے ایک مشہور حدیث ہمیں بتلاتی ہے کہ:

انما یرحم اللّٰہ من عبادہ الرّحماء

خدا کی رحمت انہیں بندوں کے لیے ہے جو اس کے بندوں کے لیے رحمت رکھتے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا مشہور کلمہ وعظ کہ زمین والوں پر رحم کرو تا کہ جو آسمانوں پر ہے تم پر رحم کرے۔ بجنسہ پیغمبر اسلام کی زبان پر یہی طاری ہوا۔

حدیث : "ارحمو امن فی الارض یرحمکم فی السّماء"

ایک سے زیادہ حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ اللہ کی رحمت رحم کرنے والوں کے لیے ہے اگر چہ یہ رحم ایک حقیر چڑیا ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔

اصل یہ ہے کہ قرآن نے خدا پرستی کی بنیاد ہی اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان اپنے قول وعمل میں خدا کی صفتوں کا پرتو پیدا کرے وہ انسان کے وجود کو ایک ایسی سرحد قرار دیتا ہے جہاں حیوانیت کا درجہ ختم ہوتا اور ایک مافوق حیوانیت کا درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسان کا جوہر انسانیت جو اسے حیوانیت کی سطح سے بلند وممتاز کرتا ہے اور جو اسے اشرف المخلوقات کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ قرآن اسے خدا کی رُوح پھونک دینے سے تعبیر کرتا ہے۔

ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ (۸.۳۲)

یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل وحواس کا چراغ روشن ہو گیا

اوپر کی آیت سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ کائنات ہستی میں انسان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ خدا نے خود اپنی رُوح اس میں پھونک دی ہے یعنی انسان کو عقل وہوش کی زندگی میں کارفرمائی کے لیے یہ جوہر ودیعت کیا گیا۔

پس قرآن جہاں جہاں خدا کی رحمت کا تصور ہمارے دماغ میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ وہ چاہتا ہے ہم بھی اپنے اندر رحمت وربوبیت کی ساری کیفیت پیدا کر لیں خدا کی دوسری صفات کو پیش کرنے کا مدعا بھی یہی ہے جس بات پر قرآن سب سے زیادہ

زور دیتا ہے وہ بخشش و درگزر ہے قرآن کی یہ تعلیم اس کا اصل اصول ہے۔ بلاشبہ اس نے یہ نہیں کہا کہ اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو لیکن اس نے یہ ضرور کہا کہ دشمنوں کو بھی بخش دو۔ جو دشمن کو بخش دینا سیکھ جائے گا۔ وہ خود بھی خدا کی بخشش کا مستحق ہو جائے گا۔ اپنے نفس کو آلودگیوں سے پاک وصاف کرنے کا طریقہ یہی ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۳. ۱۳۴)

غصہ ضبط کرنے والے اور انسان کے قصور بخش دینے والے اور اللہ کی محبت انہیں کے لیے ہے جو احسان کرنے والے ہیں

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳. ۲۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کی محبت میں (تلخی و ناگواری) برداشت کر لی اور برائی کا جواب برائی سے نہیں نیکی سے دیا تو یقین کرو یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانا ہے۔

قرآن نے بدلہ لینے سے بالکل روک نہیں دیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی اس نے اس کی اجازت دی ہے صرف تحفظ حیات کے لیے دی ہے اور پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جہاں کہیں وہ انتقام کی اجازت دیتا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ عفو و بخشش کا بہتر طریقہ ہے اور بدی کے بدلے میں نیکی کرنا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (۱۶: ۱۲۶)

اور دیکھو اگر تم بدلہ لو تو چاہیے جتنی اور جیسی کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی ہے۔ اسی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (یہ نہ ہو کہ زیادتی کر بیٹھو لیکن اگر برداشت کر جاؤ اور بدلہ نہ لیا تو یاد رکھو، برداشت کرنے والوں کے لیے برداشت کر جانے ہی میں بہتری ہے۔

وجزاء سيئة سيئة مثلها فمن عفا و اصلح فاجره على الله (۴۲: ۴۰)

اور برائی کے لیے ویسا ہی اور اتنا ہی بدلہ ہے جیسی اور جتنی برائی کی گئی ہے لیکن جس کسی نے درگزر کیا اور معاملے کو بگاڑنے کی جگہ سنوار لیا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

انجیل اور قرآن:

ہم نے ابھی یہ بیان کیا ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ اپنے دشمنوں سے بھی پیار کرو یہ بیان کچھ اور تشریح چاہتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کو ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم ومحبت اور عفوو بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا چنانچہ ہم انجیل کے مواعظ میں جا بجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں۔" تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ لیکن میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا لیکن اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیے دوسرا گال بھی آگے کر دو" تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا کہ اپنے ہمسایوں سے پیار کرو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہیں ان پر رحمت بھیجو اور جو تم سے نفرت کرتے ہیں ان سے نیکی کرو اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرو جو تمہارے ساتھ بے رحمی سے پیش آتے ہیں اور تمہیں ہلاک کرتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان خطابات کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ روحانی فضائل واخلاق کا پیام تھا یا تشریع یعنی قوانین وضع کرنا تھا۔

دعوت مسیح کی فراموشی:

مولانا آزاد اس امر پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ انجیل کے پیرو اور اس کے نکتہ چین دونوں یہاں مختلف قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے اور مسیح علیہ السلام کے اس خطاب کو ایک قطعی ضابطہ اخلاق سمجھ بیٹھے تاہم آخر کار انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا ہے ان کے باوجود پیروان مسیح نے اپنے آپ کو اس سے تسلی دے لی کہ اگر چہ یہ احکام ناقابل عمل ہیں لیکن چند مسیحیوں ولیوں اور شہیدوں نے بہر حال ان پر عمل کر

لیا تھا۔ دوسری طرف نکتہ چینوں نے کہا کہ یہ سرتا سر ایک نظری اور نا قابل عمل تعلیم ہے۔ عملی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور یہ فطرت انسانی کے صریح مغائر ہے۔ درحقیقت نوع انسانی کی یہ بڑی ہی دردانگیز ناانصافی ہے جو تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ جائز رکھی گئی ہے جس طرح بیدرد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح نادان معتقدوں نے بھی فہم و بصیرت سے انکار کر دیا کیا مسیحؑ کا پیام واقعی نا قابل عمل تھا۔ کیا وہ فطرت انسانی کے مغائر تھا؟ ایسا تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم بنیادی طور پر اس قرآنی تعلیم کو ضرب لگا رہے ہیں کہ دنیا کے تمام پیغمبروں کا پیام ایک ہی ہے۔

دعوت مسیح کی حقیقت:

اصل یہ ہے کہ پیروان مسیحؑ نے تعلیمات مسیحؑ کی حقیقت کو سمجھنے میں کوتاہی کی حضرت مسیحؑ کا ظہور تاریخ کے ایک ایسے عہد میں ہوا تھا۔ جب کہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کے بجائے محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش، دینداری و خدا پرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ جتنی متمدن اقوام قرب و جوار میں موجود تھیں مثلاً رومی مصری، اشوری وہ بھی کم و بیش اسی حالت زوال سے گزر رہی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں نے یہ نہیں جانا کہ مسیحؑ کا پیام رافت و محبت اور عفو و بخشش اور جرم گناہ کی مروجہ زندگی سے باز رکھنے کے لیے تھا اس زمانے میں انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا۔ زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا۔ آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر بنا دینا۔ اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت اور بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ ضرورت تھی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتا سر

رحمت ومحبت کا پیام ہواور انسان کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی توجہ مبذول کرے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہوئی جس نے روح پر زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوع انسانی کو توجہ دلائی اور محبت و انسانیت کا فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا۔

حضرت مسیح کا الہامی کلام مجازات کی قدرتی تاثیر کا حامل تھا لیکن اقانیم ثلاثہ اور کفارہ جیسے دوراز کار عقائد پیدا کرنے والے ان کے مواعظ کا مقصد و محل اور ان کے مجازات کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور ان کی سرتاسر لفظی تاویلات میں پڑ کر گمراہ ہو گئے۔

حضرت مسیح نے جہاں کہیں یہ کہا کہ اپنے دشمن سے پیار کرو تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے دشمنوں کا عاشق زار ہو جائے بلکہ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ تھا کہ تم میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی بجائے رحمت و محبت کا پر جوش جذبہ ہونا چاہیے ایسے گردو پیش میں جہاں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی نفرت کا برتاؤ کیا جاتا ہو یہ کہنا کہ اپنے دشمنوں سے پیار کرو، یقیناً نفرت و غضب سے کنارہ کش ہونے کا ایک کامل ترین جذبہ پیدا کر سکتا تھا۔ یا مثلاً اگر انہوں نے کہا تھا اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو، یقیناً مسیح کے ذہن میں اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا دوسرا گال آگے کر دیا کرو بلکہ صریح مطلب یہ تھا کہ اپنے اندر عفو و درگزر کا جذبہ پیدا کرو۔ ہر بلیغ کلام کے لفظی معنی لینا شائستہ ذہن کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس طرح کے مجازات کو ان کے ظواہر پر محمول کرنے لگیں تو نہ صرف تمام الٰہی تعلیمات ہی درہم برہم ہو جائیں گی۔ بلکہ انسان کا وہ تمام کلام جو الہام و بلاغت کا مرقع ہے یک قلم مختل ہو جائے گا۔

بلاشبہ مذاہب و قوانین نے جرم و گناہ کے لیے تعزیرات و عقوبت کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ انسانی معیشت کے لیے یہ ناگریز ہے لیکن تعزیر و عقوبت کا مدعا صرف یہ ہوتا ہے یا صرف

اس لیے گوارا کیا جاتا ہے کہ بڑے درجہ کی برائیوں کو روکنے کے لیے ایک کم درجہ کی برائی کو برداشت کر لیا جائے خالص مذہبی نقطہ نظر سے تعزیر و عقوبت کی غایت اس سے زیادہ نہیں لیکن دنیا نے اسے تعذیب و ہلاکت کا خوف ناک آلہ بنا لیا۔ چنانچہ ہم اسے دیکھتے ہیں کہ انسانی قتل و غارت گری کی کوئی ہولناکی ایسی نہیں ہے جو شریعت اور قانون کے نام سے نہ کی گئی ہو اگر تاریخ سے پوچھا جائے کہ جنگ و جدال کو چھوڑ کر انسانی ہلاکت و بربادی کی سب سے بڑی قوتیں کون کون سی رہی ہیں تو یقیناً اس کی انگلیاں ان عدالت گاہوں کی طرف اُٹھ جائیں گی جو مذہب اور قانون کے راہ سے قائم کی گئیں اور جنہوں نے ہمیشہ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل جاری رکھا۔ حضرت مسیحؑ کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ نفس تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کریں بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ انسان عفو و محبت کے جذبات کو موجزن کر دیں وہ بتلانا چاہتے تھے کہ اعمال انسانی میں اصل رحم و محبت ہے اور عقوبت و انتقام ایک آخری شکل اور ایک ناگزیر علاج ہے۔

شریعت موسوی کے پیروؤں نے بھی شریعت کو صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا حضرت مسیحؑ نے بتلایا کہ شریعت صرف سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ نجات کی راہ دکھانے آتی ہے اور نجات کی راہ سرتاسر رحمت و محبت کی راہ ہے۔

عمل اور عامل:

دراصل اس بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ رہی ہے کہ وہ ''عمل'' اور ''عامل'' میں امتیاز قائم نہیں رکھتا، مذہب اس فرق و امتیاز کو واضح طور پر پیش کرتا ہے تمام مذاہب کا یہ مقصد رہا ہے کہ بدعملی اور گناہ کے عمل کی طرف سے انسان کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کی جائے لیکن یہ انہوں نے کبھی گوارا نہیں کیا خود انسان کی طرف سے انسان کے اندر نفرت پیدا ہو جائے یقیناً انہوں نے زور دیا ہے کہ گناہ سے نفرت کرو

لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ گناہ گار سے نفرت کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طبیب ہمیشہ لوگوں کو بیماریوں سے ڈراتا رہتا ہے اور ان کے مہلک نتائج کا ہولناک نقشہ پیش کرتا رہتا ہے لیکن یہ تو وہ کبھی نہیں کرتا جو لوگ بیمار ہو جائیں ان سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگے بلکہ اس کی تو ساری توجہ اور شفقت کا مرکز بیماری کا وجود ہوتا ہے اور جو انسان جتنا زیادہ بیمار ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ اور شفقت کا مرکز بن جائے گا اور یہی شیوہ روح و دل کے طبیبوں کا ہوتا ہے وہ گناہ گار سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے سراپا رحمت وشفقت بن جاتے ہیں وہ یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں گناہوں سے نفرت پیدا کردیں گناہ گار انسانوں سے نہیں اور فرق و امتیاز کا یہی وہ نازک مقام ہے جہاں بڑے بڑے پیروان مذہب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ حضرت مسیحؑ کی تعلیم سرتاسر اسی حقیقت پر مبنی تھی کہ گناہوں سے نفرت کرو مگر ان انسانوں سے نفرت نہ کرو جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ لطف و رافت کا برتاؤ کرو تا کہ وہ اپنے ماضی کے گناہوں کی تلافی کرسکیں اور انسانی زندگی کے لیے دوبارہ ایک متاع عزیز بن جائیں بعض ائمہ تابعین نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ **انکسار العاصیین احب الی اللّٰہ من صولۃ المطیعین** خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے کہیں زیادہ گناہ گار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے اور پھر یہی حقیقت ہے کہ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں خدا نے گناہ گار انسانوں کو مخاطب کیا ہے تو عموماً یائے نسبت کے ساتھ کیا ہے جو تشریف و محبت پر دلالت کرتی ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۳۹: ۵۳)

اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔

ءَ اَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ (۲۵ : ۱۷)

کیا تم نے میرے بندوں کو گمراہ کیا تھا۔

اس طرز تخاطب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک باپ جوش محبت میں بیٹے کو پکارتا ہے اسے میرے فرزند! اے میرے فرزند پیغمبر اسلام کے پڑنواسے حضرت امام جعفر صادق نے سورہ زمر کی آیت رحمت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے، جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف وخطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں ہم ان پر غضب ناک نہیں، قرآن میں خدا نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں ''عبادی'' کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گناہ گار انسان کو بھی ''یعبادی'' کہہ کر پکارا ہے کیا اس سے بھی بڑھ کر اس کی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے۔

انجیل اور قرآن کی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں:

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ فی الحقیقت حضرت مسیحؑ کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا معیار احکام ایک ہی ہے فرق صرف محل بیان اور پیرایہ بیان کا ہے حضرت مسیحؑ نے صرف تزکیہ قلب پر زور دیا ہے اور کوئی نئی شریعت نہیں پیش کی کیونکہ شریعت موسوی موجود تھی اور وہ اس میں تبدیلی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ اس شریعت کو تزکیہ قلب کے لیے استعمال کیا جائے لیکن قرآن بیک وقت اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بیان کرتا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس نے ایک ایسا اسلوب اور پیرایہ بیان اختیار کیا جو مجازات اور متشابہات کی جگہ احکام وقوانین کا صاف صاف تلا پیرایہ بیان تھا اس نے سب سے پہلے عفو و درگزر پر زور دیا اور اسے نیکی اور فضیلت کی اصل قرار دیا دوسرے یہ کہ ناگزیر صورتوں میں بدلہ لینے اور سزا دینے کا دروازہ بھی کھلا رکھا اور تیسرے یہ نہایت واضح اور قطعی لفظوں میں اس نے کہہ دیا کہ بدلے اور سزا میں زیادتی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ وہ ناانصافی ہوگی تمام مذاہب کا ماحصل یہی تین اصول رہے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَاۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۴۲: ۴۰: ۴۳)

اور دیکھو برائی کے بدلے ویسی ہی اور اتنی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی بخش دے اور بگاڑنے کی جگہ سنوارے تو یقین کرو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرنے والے ہیں اور جس کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور وہ ظلم کے بعد اس کا بدلہ لے لے تو اس پر کوئی الزام نہیں الزام ان لوگوں پر ہے، جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق ملک میں فساد کا باعث ہوتے ہیں سو یہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے اور جو کوئی بدلہ لینے کے بجائے برائی برداشت کر جائے۔ اور بخش دے تو یقیناً یہ بڑی اوالوالعزمی کی بات ہے۔

غور کرو عفو درگزر پر زور دیا گیا ہے اگرچہ انتقام وسزا کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے لیکن بتا دیا گیا ہے کہ نیکی وفضیلت کی راہ دراصل عفو ودرگزر ہی کی راہ ہے پھر اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ قرآن نے اس سزا کو جو برائی کے بدلے میں دی جائے ''برائی'' ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ''سیئۃ'' کے بدلے میں جو کچھ کیا جائے گا وہ بھی ''سیئۃ کے مانند'' ہی ہوگا بے شک برائی کبھی نیکی نہیں بن سکتی لیکن سزا کا دروازہ اس لیے کھلا رکھا گیا ہے کہیں زیادہ بڑی برائیاں ظہور میں نہ آنے لگیں پھر اس آدمی کی نسبت جو معاف کر دے۔ اصلح کا لفظ کہا ہے۔ یعنی'' سنوارنے والا'' اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کے اصلی سنوارنے والے ہی وہی ہوتے جو عفو ودرگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں ممکن ہے یہاں یہ خدشہ محسوس کیا جائے کہ اگر فی الحقیقت قرآن کی تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے تو پھر اس نے اپنے مخالفوں کی نسبت

سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا اس کا مفصل جواب تو اپنے محل پر آئے گا لیکن یہاں اس سلسلہ میں ایک مختصر اشارہ کیا جاتا ہے، بلاشبہ قرآن میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں اس نے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے پیغمبر اسلام کے زمانہ میں قرآنی تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہت سخت پیرایہ بیان اختیار کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کن مخالفوں کے لیے؟ ان کے لیے جن کی مخالفت محض اختلاف فکر و عقائد کی مخالفت تھی؟ یا ان کے لیے جن کی مخالفت نے جارحانہ معاندت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے جہاں کہیں بھی مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے سختی کا اظہار کیا ہے۔ وہ وہی مخالفین ہیں جنہوں نے قرآن پر ایمان لانے والوں کو عمداً ہلاک کیا اور ان کے ساتھ جارحانہ عناد و شرارت کا سلوک کیا ایسے مخالفوں کے ساتھ بھی نرمی شفقت کا برتاؤ انسانیت کی بدخدمتی کے مترادف ہوتا یہ ایک ایسی رحمت ہوتی جو ظلم و فساد اور شرارت و ناانصافی کی پرورش کرنے والی ہوتی، قرآن نے صفات الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی جگہ دی ہے جس کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔ قرآن رحمت کو عدالت سے علیحدہ نہیں کرتا بلکہ اسے عین رحمت قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے تم انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ کر ہی نہیں سکتے اگر ظلم و شرارت کے لیے تم میں سختی نہیں ہے انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کی ٹولی" کہنے پر مجبور ہوئے۔

کفر محض اور کفر جارحانہ: قرآن نے کفر کا لفظ انکار کے معنی میں استعمال کیا ہے انکار دو طرح کا ہوتا ہے ایک انکار محض ایک انکار جارحانہ، کفر محض یا انکار محض کئی شکلیں اختیار کر سکتا ہے ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا اس لیے کہ وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لیے کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے یہ کفر محض ہے اس لیے قرآن کہتا ہے اے پیغمبر کہہ دے لکم دینکم ولی دین تمہارے لیے تمہارا راستہ اور

میرے لیے میرا راستہ لیکن جارحانہ انکار محض سے مختلف ہوتا ہے۔ جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنی ہی قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے مخالف اپنی پوری قوت کے ساتھ تمہاری ہلاکت و بربادی کے درپے ہو جائیں گے اور تم کتنی ہی سچی بات کہو وہ تمہیں جھٹلائیں گے اور تمہیں چین نہیں لینے دیں گے اسی نوعیت کے مخالفین کی نسبت قرآن ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے جو سخت معلوم ہوتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹)

ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں وہ ایسے ہوگئے ہیں جیسے چارپائے نہیں بلکہ چارپایوں سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ میں جب کبھی سچائی کی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے کچھ نے انکار کیا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے عمداً پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی ہے۔ قرآن کو ان تینوں قسم کی انسانی جماعتوں سے عہدہ برا ہونا تھا۔ اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، دوسری جماعت کو اپنا پیغام سنایا اور اس پر غور و خوض کرنے کی مہلت دی اور کہا کہ لا اکراہ فی الدین لیکن تیسری جماعت کے ساتھ وہ زجر و توبیخ سے پیش آیا۔ اگر ایسی جماعت کے لیے بھی قرآن لطف و رحمت کا لب و لہجہ اختیار کرتا تو اس کا مطلب جارحانہ قول و عمل کے آگے جھک جانے کے ہوتا اور یہ چیز قانون فطرت کے خلاف ہوتی رحمت ہمیشہ عدالت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے کائنات فطرت میں یہ عام قانون کارفرما ہے جس کی پابندی دنیائے اسلام کے لیے ضروری ہے۔

باب چہارم

خدا کی صفت عدل

ربوبیت اور رحمت کے بعد قرآن میں خدا کی جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس کی صفت عدل ہے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ نزول قرآن کے وقت جزا کا جو اعتقاد تھا قرآن اسے رد کرتا ہے وہ جزا کو انسان کے اعمال کا ناگزیر نتیجہ اور مکافات قرار دیتا ہے۔ جزا کا قدیم عقیدہ مطلق العنان بادشاہوں کی شاہیت اور الوہیت سے اخذ کردہ تھا۔ اسی کی مشابہت میں لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ خدا بھی مطلق العنان بادشاہوں کی طرح من مانے انعام واکرام اور سزائیں دینے لگتا ہے اسی واسطے اس زمانہ کے لوگ دیوتاؤں کا جوش غضب ٹھنڈا کرنے لیے طرح طرح کی قربانیاں اور ان کی نظر التفات حاصل کرنے کے لیے نذریں چڑھاتے تھے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا تصور الٰہ دیوبانی تصور سے قدرے بلند ہوگیا تھا۔ لیکن پرانے زمانے کے عام تصور کی بنیادی خصوصیت بدستور باقی تھی۔ یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ دوسروں کے دیوتاؤں کی طرح خدا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا۔ جو ان سے خوش ہوتا تو اسرائیل کے خدا کی حیثیت اختیار کر لیتا اور ناخوش ہوتا تو جوش انتقام میں آ کر ان کی بربادی وہلاکت کا سبب بن جاتا۔ عیسائیوں کا اعتقاد تھا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے اس کی پوری نسل مغضوب ہوگئی اور جب تک خدا نے اپنی صفت ابنیت کو بشکل مسیح قربان نہیں کر دیا اس کے نسلی گناہ اور مغضوبیت کا کفارہ نہ ہو سکا۔

لیکن قرآن نے جزا و سزا کا اعتقاد ایک دوسری ہی شکل و نوعیت کا پیش کیا ہے، وہ اسے خدا کا کوئی ایسا فعل قرار نہیں دیتا جو کائنات ہستی کے عام قوانین و نظام سے الگ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک عالمگیر قانون مکافات عمل پیرا ہے کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے۔ فکر احساس یا عمل کی شکل میں ہر شے کوئی نہ کوئی خاصہ رکھتی ہے اور اپنے اچھے یا برے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور اسی کا نام جزا و سزا یا عذاب و ثواب ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ اسی طرح برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور عذاب ہے ایک کو بہشت سے اور دوسرے کو دوزخ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی ایک مخصوص فطرت رکھتی ہے اور یہی حال انسانی اعمال کا بھی ہے۔ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور اسی کو قرآن جزا و سزا عذاب و ثواب یا عدالت کہتا ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵: ۲۱ ۔ ۲۲)

ترجمہ: جو لوگ برائیاں کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان رکھتے ہیں اور جن کے اعمال اچھے ہیں؟ دونوں برابر ہو جائیں، زندگی میں بھی اور موت میں بھی اگر ان لوگوں کی فہم و دانش کا فیصلہ یہی ہے تو) افسوس ان کے فیصلے پر اور اللہ نے آسمان و زمین کو بیکار و عبث نہیں بنایا ہے اور اس لیے بنایا ہے کہ ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ ملے اور یہ بدلہ ٹھیک ٹھیک ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر اچھے اور برے عمل کو کسب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ عربی

میں کسب کے لفظی معنی ہیں ایسے کام جس کے نتیجہ سے تم کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہو۔ یعنی کسب کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے لیے جزا و سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے قرآن نے سورہ بقرہ میں جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ بتلا دیا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲ : ۲۸۶)

ہر انسان کے لیے وہی ہے جیسی کچھ اس کی کمائی ہوگی جو کچھ اسے پانا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے ہے اور جس کے لیے اسے جواب دہ ہونا ہے۔ وہ بھی اس کی کمائی سے ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ○ (۴۱ : ۴۶)

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور جس نے برائی کی تو خود اسی کے آگے آئے گی۔ اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لیے ظلم کرنے والا ہو۔

اس اصول کا اطلاق قوموں اور جماعتوں پر بھی ہوتا ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲: ۱۴۱)

یہ ایک امت تھی جو گزر چکی ہے اس کے لیے وہ نتیجہ تھا جو اس نے کمایا اور تمہارے لیے وہ نتیجہ ہے جو تم کماؤ گے۔

ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی اصول حیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

حدیث : یا عبادی لوان اوّلکم واٰخر کم و انسکم و جنکم کانو اعلٰی اَتقٰی قلب رجل واحد منکم مازادوا فی ملکی شیئا یا عبادی لوان اولکم واٰخر کم وانسکم و جنکم کانوا علٰی افجر قلب رجل واحد منکم مانقص ذالک من ملکی شیئاً یا عبادی لوان اولکم و آخر کم وَ انسکم وجنکم قاموافی صعید و احد فسالونی فاعطیت کل انسان مسئلة مانقص

ذالک ممّا عندی الا کما ینقص المخیط اذا دخل البحر یا عبادی انمّا ھی اعمالکم احصیھا لکم ثم اوفیکم ایاھا فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذالک فلا یلومن الانفسہ O(مسلم عن ابی ذر)

ترجمہ :اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس وجن اس شخص کی طرح نیک ہو جائے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری خداوندی میں کچھ اضافہ نہیں ہوگا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جائے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اس سے میری خداوندی میں نقصان نہ ہوگا، اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس سے منہ مانگی مراد بخش دیتا تو میری رحمت وبخشش کے خزانے میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی ،جتنی کمی سوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے ۔اے میرے بندو یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور انہیں کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں پس جو کوئی تم میں اچھائی پائے اسے چاہیے کہ اللہ کی حمد وثنا کرے اور جس کسی کو برائی پیش آئے تو چاہیے کہ خود اپنے وجود کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔

یہاں یہ خدشہ کسی کے دل میں واقع نہ ہو کہ جزا وسزا محض خدا کی خوشنودی یا ناراضی کا نتیجہ ہے ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ جزا وسزا تمام تر انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا نیک عمل سے خوش ہوتا ہے اور بدعمل سے ناراض ہوتا ہے یہ تصور اس سے پہلے کے معتقدات کا نقیض ہے بہر حال جزا کے اس قانون کے لیے الدین کی اصطلاح نہایت موزوں ہے اور ان تمام

غلط تصورات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جو اس بارے میں پھیلی ہوئی تھیں سورہٗ فاتحہ میں اس کے استعمال نے نیکی اور برائی سے پیدا ہونے والے نتائج جزا و سزا کی اصلی حقیقت آشکار کر دی ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن نے ربوبیت اور رحمت کے بعد خدا کی صفت قہر و جلال میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا ہے بخلاف ازیں وہ خدا کو "مالک یوم الدین" بیان کرتا ہے جس سے ربوبیت اور رحمت دونوں صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا تصور ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے اس میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں البتہ عدل ضرور ہے اور صفات قہریہ جس قدر بیان کی گئی ہیں۔ دراصل اسی کے مظاہر ہیں جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے کام کرتی رہتی ہیں۔

فی الحقیقت صفات الٰہی کے تصور کا یہی وہ مقام ہے جہاں فکر انسانی نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے اس نے کائنات ہستی کے تمام ناخوشگوار واقعات کو خدا کی نارضا مندی کا مظہر قرار دے دیا۔ اور قہر و غضب کی صفات کو صفات الٰہی پر محمول کیا، حالانکہ اگر وہ فطرت کائنات کی حقیقت کو قریب سے دیکھتا تو معلوم کر لیتا۔ کہ جن مظاہر کو وہ خدا کے قہر و غضب پر محمول کر رہا ہے وہ عین مقتضائے رحمت ہیں اگر فطرت کائنات میں قانون مکافات جاری و ساری نہ ہوتا یا مدارج تکمیل طے کرنے کے لیے راستہ کے حائلات دور نہ کئے جاتے تو میزان عدل قائم نہ رہتا اور تمام نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

جس طرح کارخانہ خلقت اپنے وجود و بقا کے لیے خدا کی ربوبیت اور رحمت کا محتاج ہے اسی طرح اپنی تکمیل کے لیے اس کے عدل کا بھی محتاج ہے ربوبیت اور رحمت زندگی کے لیے افادہ و فیضان کا سرچشمہ ہے اور اسی سے بناؤ اور خوبی ظہور میں آتی ہے اور نقصان و فساد کا ازالہ ہوتا ہے اگر تم کائنات خلقت کے اس پہلو کا بہ نظر غور مشاہدہ کرو تو دیکھو گے کہ یہاں

خوبی و جمال اور بناؤ سلجھاؤ میں سے جو کچھ ہے وہ سب کچھ قوت عدل کا ظہور ہے۔

عربی میں معدلت یا عدل کے معنی برابر ہونا ہے عدالت کا کام دو فریقوں کی باہم ودگر زیادتیوں کو دور کر دینا ہوتا ہے۔ ترازو کے تول کو بھی عدل یا معدلت کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں پلڑوں کا وزن برابر کر دیتا ہے معدلت زندگی میں تناسب پیدا کر دیتی ہے اور ایک جز کو دوسرے جز کے برابر لا کر اتحاد با ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتی ہے یہی قانون ہے جو زندگی اور فکر کے ہر اسلوب میں حسن و تناسب کا نکھار پیدا کرتا ہے۔ کارخانہ ہستی کا سارا نظام ہی عدل و توازن پر قائم ہے نظام شمسی کا ہر کرہ ہر ستارہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص نظام توازن میں جکڑا ہوا اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے یہی وہ قانون ہے جو نظام معاشرت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، اگر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ ساکت ہو جائے تو تمام نظام عالم مختل ہو کر رہ جائے۔

قرآن ہم سے یہ غور کرنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ جب یہ اصول نصف کائنات خلقت کے ہر گوشے میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے اعمال و افکار اس کے اثر سے خارج ہو جائیں اسی لیے اس پورے عمل توازن و تناسب کو جو زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہے۔ قرآن عمل صالح کے نام سے تعبیر کرتا ہے اس کے علاوہ بد عملی یا برائی کے لیے جتنی تعبیرات اختیار کی ہیں سب ایسی ہی ہیں کہ اگر ان کے معانی پر غور کیا جائے تو عدل و توازن کی ضد اور مخالف ثابت ہوں گی، مثلاً ظلم، طغیان، اسراف، تبذیر، افساد، اعتدا اور عدوان وغیرہ جسے ہم ظلم کہتے ہیں۔ عربی میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جو بات جس جگہ ہونی چاہیے وہاں نہ ہو یا بے محل ہو اسی لیے قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا بے محل ہونا یا اپنی صحیح جگہ پر نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو حقیقت عدل کے منافی ہے۔ اسی طرح طغیان کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی حد سے گزر جانا

جب دریا کا پانی اپنی حد سے بلند ہو جاتا ہے تو طغیان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ حد سے تجاوز توازن وعدل کے منافی ہے، اسراف (فضول خرچی) تبذیر (غلط استعمال) اور فساد (شرارت وفساد) بھی اس شعبہ میں آتے ہیں اعتدا اور عدوان دونوں کے معنی حد سے گزر جانے کے ہیں پس ہر وہ شے جو بے محل ہو تعمیر وتکمیل کے راستے کی رکاوٹ ہے جس کو راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔ اور عدل یہی کام انجام دیتا ہے قرآن کے الفاظ میں خدا کی رحمت یا رحمانیت کا اظہار ہے۔

حصہ پنجم

وحدت دین

جزاوسزا کا قانون جس کا گزشتہ باب میں ذکر ہوا ہے انسانی ذمہ داریوں کے سوال سے بحث کرتا ہے ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ عذاب وثواب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ربوبیت الٰہی جس کا مقصد کائنات ہستی کی پرورش اور نشوونما ہے انسان کو یہ صلاحیت عطا کرتی ہے کہ وہ یقین و اطمینان کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے جس سے زندگی میں سابقہ پڑتا ہے بہ الفاظ دیگر کیا انسان میں اس بات کی استعداد ہوتی ہے اور کیا اسے ایسے مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنے لیے وہ راہ عمل انتخاب کر سکے جو اس کو مطلوبہ بھلائی کی طرف لے جائے تاکہ اس کے اعمال وافعال پر جزاوسزا کے قانون کو حق بجانب قرار دیا جا سکے؟ قرآن اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰیo وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷: ۲: ۳)

وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اسے درست کیا پھر ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اس پر راہ (عمل کھول دی)۔

اس آیت میں تکوین وجود کے جو مرتبے بیان کئے گئے ہیں، وہ تخلیق، تسویہ، تقدیر و ہدایت کے مرتبے ہیں۔ ارشاد قرآنی ہے کہ جس طرح خدا کی ربوبیت نے ہر وجود کو اس کا جامہ ہستی عطا فرمایا، اس کے ظاہری و باطنی قویٰ درست کیے۔ اور اس کے اعمال کے لیے ایک مناسب حال اندازہ ٹھہرا دیا۔ اسی طرح اس کی ہدایت کا بھی سروسامان کر دیا۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰: ۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔

پھر قرآن نے ہدایت کے بھی چار مرتبے بیان کیے ہیں وجدان، حواس عقل اور وحی و نبوت، ہدایت کے پہلے دو مرتبے انسان اور حیوان سب کے لیے ہیں۔ لیکن تیسرا مرتبہ یعنی مرتبہ عقل، انسان کے لیے خاص ہے لیکن یہ سب مرتبے اپنا محدود دائرہ عمل رکھتے ہیں۔ جہاں وجدان کی ہدایت ختم ہو جاتی ہے جو اس کی ہدایت رہبری کرنے کے لیے آ جاتی ہے تو عقل کی ہدایت دستگیری کرتی ہے لیکن عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی اسی لیے ضروری تھا جیسا کہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے لیے خدا کی ربوبیت اور رحمت کے ساتھ ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا سامان کر دیا جائے یہی وہ مرتبہ ہدایت ہے۔ جسے قرآن وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰىؕ (۲: ۱۲۰)

(اے پیغمبر) ان سے کہہ دو اللہ کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ''الھدیٰ'' ہے (یعنی ہدایت کی حقیقی اور عالمگیر راہ، اسی عالمگیر ہدایت وحی کو قرآن نے ''الدین'' اور ''اسلام'' کے نام بھی دیے ہیں، یعنی خدا کے بنائے ہوئے قوانین حیات کو تسلیم کرنے کا راستہ۔

وحدت دین:

قرآنی تعلیم کا اصل اصول یہی وحدت دین ہے جو ہمیشہ ایک ہی رہی ہے لیکن مولانا آزاد کہتے ہیں کہ تاریخ عالم کے عجائب تصرفات میں سے یہ واقعہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جس درجہ قرآن نے اس اصل پر زور دیا تھا اتنا ہی زیادہ دنیا کی نگاہوں نے اُس سے اعراض کیا، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی کوئی اور صداقت دنیا کی نظروں سے اس قدر پوشیدہ نہیں ہے۔ جس قدر کہ یہ اصل عظیم اگر ایک شخص ہر طرح کے خارجی حالات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے اور اس میں جا بجا اس اصل عظیم کے قطعی اور واضح

اعلانات پڑھے اور پھر دنیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیے تو وہ حیران ہو کر رہ جائے گا کہ ان قطعی اعلانات کے باوجود قرآن کی حقیقت کو بھی بہت سی مذہبی گروہ بندیوں کی طرح ایک مذہبی گروہ بندی کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

اس حقیقت کی توضیح کے لیے مولانا نے ضروری سمجھا کہ تفصیل کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ جہاں تک وحی ونبوت کا تعلق ہے قرآن کی دعوت کیا ہے اور وہ کس راہ کی طرف نوع انسان کو لے جانا چاہتی ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ اس باب میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابتداء میں نسل انسانی ایک قوم کی طرح رہتی اور قدرتی زندگی بسر کرتی تھی بعد میں چل کر کثرت اور ضروریات معیشت کے دباؤ کے باعث طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور جمعیت انسانی مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور ہر گروہ دوسرے سے نفرت کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو گئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے عدل و صداقت کی روشنی نمودار ہو۔ تا کہ وہ پھر متحد ہو سکیں، چنانچہ خدا کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا اور نوع انسانی کو اتحاد و یگانگت کی تعلیم دینے کے لیے یکے بعد دیگر خدا کے نبیوں کا ظہور ہونے لگا۔ انسانیت کے ان محسنوں کو خدا۔ رسل (واحد رسول) یا پیغمبر کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ کیونکہ وہ بنی نوع انسان کو خدا کی سچائی کا پیام پہنچانے والے تھے۔ ان تمام پیغمبروں کا پیام ایک ہی تھا اور کسی خاص گروہ یا ملک یا قوم کے لیے مخصوص نہ تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں نسل انسانی آباد ہوئی ہو اور خدا کا کوئی رسول معبوث نہ ہوا ہو۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (۸۔۱۲) قرآن کہتا ہے کہ کتنے ہی پیغمبر یکے بعد دیگرے مبعوث ہوئے جنہوں نے قوموں کو پیغام حق پہنچایا۔ ان میں سے بعض کا نام قرآن میں لیا گیا ہے اور بعض کا نہیں۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ○ (۴۳ : ۶)

اور کتنے ہی نبی ہیں جو ہم نے پہلوں میں (یعنی ابتدائی عہد کی قوموں میں) میں مبعوث کیے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۱۷ : ۱۵)

اور ہمارا قانون یہ ہے کہ جب تک ہم ایک پیغمبر مبعوث کر کے راہ ہدایت نہ دکھا دیں اس وقت تک (پاداش عمل میں) عذاب دینے والے نہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (۴۰ : ۷۸)

اور (اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی پیغمبر مبعوث کیے ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تمہیں سنائے ہیں کچھ ایسے ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (یعنی قرآن میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

ہر عہد میں خدا کا راستہ ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، وہ کسی حال میں بدل نہیں سکتا پس بنی نوع انسان کے لیے اس کی ہدایت بھی اول دن سے ایک ہی طرح کی ہے اور یہ ہدایت کیا تھی صرف یہ کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ اور نیک عملی کی زندگی بسر کرو ہر عہد میں اور ہر قوم کے لیے خدا نے دین کا یہی ایک راستہ بتایا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶ : ۳۶)

اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے (یعنی سرکش اور شریر قوتوں کے اغویٰ سے) اجتناب کرو۔

قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی بانی مذہب بھی ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے اور تفرقہ و اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو، سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا

دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے پس اس غرض کے لیے ایک پروردگار عالم کی بندگی میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ ومخاصمت کی جگہ باہمی محبت اور یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (۲۳: ۵۲)

اور (دیکھو) یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس (میری عبودیت ونیاز کی راہ میں تم سب ایک ہو جاؤ اور نافرمانی سے بچو۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲: ۱۳)

اور دیکھو اس نے تمہارے لیے دین کی وہی راہ قرار دی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم موسیٰ وعیسیٰ کو دیا تھا (ان سب کی تعلیم یہی تھی) کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ نہ ہو جاؤ۔

قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر الہامی کتاب نے خدا کی راہ پر چلنے کی تعلیم دی ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱: ۲۴)

اے پیغمبر ان سے کہہ دو اگر تمہیں میری تعلیم سے انکار ہے تو اپنی دلیل پیش کرو یہ تعلیم موجود ہے جس پر میرے ساتھی یقین رکھتے ہیں اور جو مجھ سے پہلے قوموں کو دی گئیں (تم ثابت کر دکھاؤ۔ کسی نے بھی میری تعلیم کے خلاف تعلیم دی ہو) اصل یہ ہے کہ (ان منکرین حق) میں اکثر آدمی ایسے ہیں جنہیں سرے سے امر حق کی خبر ہی نہیں اور اس لیے حقیقت کی طرف سے گردن موڑے ہوئے ہیں (اے پیغمبر) یقین کر ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر بھی

ایسا نہیں بھیجا۔ جسے اس بات کے سوا کوئی دوسری بات بتلائی گئی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔

اتنا ہی نہیں بلکہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ ہر پیغمبر کی تعلیم دوسرے پیغمبر کی تعلیم کی تصدیق کرتی ہے کیونکہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (۳ : ۲)

(اے پیغمبر) اللہ نے تم پر یہ کتاب سچائی کے ساتھ نازل کی ہے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت کے لیے اس نے تورات اور انجیل نازل کی ہے۔

الدین اور الشرع:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وحی الٰہی نے ایک ہی اصول زندگی کی تعلیم دی ہو۔ تو پھر مذاہب میں اختلاف کیوں پیدا ہوا۔ اور تمام مذہبوں میں ایک ہی طرح کے احکام ایک طرح کے رسوم وظواہر کیوں نہ ہوئے۔

قرآن کہتا ہے کہ مذاہب کا اختلاف دو طرح کا ہوتا ہے ایک اختلاف تو وہ ہے جو پیروان مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے منحرف ہو کر پیدا کر لیا ہے۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جو مذہبی تعلیم کے نفاذ و اطلاق میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مذہب میں عبادت کی کوئی خاص شکل مقرر کی گئی ہے دوسرے میں کوئی دوسری شکل، تو یہ اختلاف دین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیم کے اطلاق یعنی شرع کا اختلاف اس لیے دین اور شرع میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ دین میں کسی قسم کا انحراف قبول نہیں ہو سکتا۔ ہر عہد اور ہر قوم کے لیے وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن انسانی جمعیت کے احوال وظروف ہر عہد

میں بدلتے رہتے ہیں۔

پس ہر زمانے کے مزاج اور اس دور کے لوگوں کی استعداد و طبیعت کے مطابق شرع و منہاج کی شکل میں تبدیلی ضرور ہوتی رہی اور جب تک خدا کی توحید اور نیک عملی کے بنیادی راستے میں اس کی وجہ سے انحراف نہیں ہوتا اس میں کوئی قباحت نہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۲ : ۶۷)

(اے پیغمبر) ہم نے ہر گروہ کے لیے عبادت کا ایک خاص طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چلتا ہے پس لوگوں کو چاہیے اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں، تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف دعوت دو یقیناً تم ہدایت کے راستے پر گامزن ہو۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲ : ۱۴۸)

اور دیکھو ہر گروہ کے لیے کوئی نہ کوئی سمت ہے جس کی طرف عبادت کرتے ہوئے وہ اپنا منہ کر لیتا ہے پس (اس معاملہ کو اس قدر طول نہ دو) نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو کہ اصلی کام یہی ہے تم کسی جگہ بھی ہو اللہ تم سب کو پالے گا یقیناً اللہ کی قدرت سے باہر کوئی چیز نہیں۔

ان آیتوں پر نظر ڈالنے سے دین اور منہاج شریعت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ دین عبارت ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی اور شرع نام ہے اس اصول کو روبہ عمل لانے اور اس کو جانچنے کا معیار اچھائیوں کے نتائج و نوعیت پر منحصر ہوتا ہے دین کے حقیقی عناصر کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۲ : ۱۷۷)

اور دیکھو نیکی یہ نہیں ہے کہ تم عبادت کے وقت اپنا منہ پورب کی طرف اور پچھم کی طرف کرلیا کرو (یا اس طرح کی کوئی دوسری بات ظاہری رسم اور ڈھنگ کی کرلی) نیکی کی راہ تو اس کی راہ ہے جو اللہ پر آخرت کے دن پر ملائکہ پر تمام کتابوں پر اور تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے اپنا مال خدا کی محبت کی راہ میں رشتہ داروں یتیموں مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتا ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرتا ہے نماز قائم کرتا ہے زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قول و اقرار کا پکا ہوتا ہے تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں ثابت قدم رہتا ہے۔ سو یاد رکھو ایسے ہی لوگ ہیں جو (اپنی دینداری میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو برائیوں سے بچنے والے ہیں۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ قرآن میں یہ آیت ہے اس کے باوجود اگر قرآن کی دعوت کے اصل مقصد کو دنیا اب تک نہیں سمجھ سکی ہے تو بلاشبہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے۔

دین کی وحدت کو فراموش کردیا گیا:

جب قرآن کا ظہور ہوا تو حال یہ تھا کہ تمام مروجہ مذہب کے پیرو مذہب کو صرف اس کے رسوم میں دیکھتے تھے اور مذہبی اعتقاد کا تمام جوش و خروش اسی قسم کی باتوں میں سمٹ گیا تھا ہر

گروہ کا یہ ایمان تھا کہ دوسرا گروہ نجات سے محروم رہے گا۔ محض اس بنا پر کہ دوسرے کے اعمال ورسوم ویسے نہیں ہیں جیسے خود اس نے اختیار کر رکھے ہیں، لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں یہ اعمال ورسوم نہ تو دین کی اصل ہیں اور نہ سچائی کی کسوٹی بلکہ یہ دین کا محض ایک ظاہری ڈھانچہ ہیں روح وحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی اصل دین ہے یہ اصل دین کیا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسانی کی مشترکہ میراث ہے۔ اعمال ورسوم کی حیثیت فروعی ہے جو وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے قرآن کہتا ہے کہ تم میں سے ہر جماعت کے لیے ہم نے ایک قانون (شرع) اور ایک کھلا راستہ (منہاج) ٹھہرا دیا ہے۔ یہاں دین کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ دین تو سب کے لیے ایک ہی ہے اس میں انحراف وتنوع نہیں ہوسکتا۔ البتہ شرع و منہاج قدرتی طور پر سب کے لیے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں کہیں قرآن نے اس چیز پر زور دیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام انسان ایک ہی راہ پر جمع ہو جاتے یا ایک ہی قوم بن جاتے۔ وہ اس بات کو لوگوں کے دلوں میں اتار دینا چاہتا ہے کہ مختلف ملکوں میں رہنے والی مختلف اقوام کے مختلف گروہوں میں فکر وعمل کا اختلاف موجود ہے اور یہ طبیعت بشری کا قدرتی خاصہ ہے پس اس اختلاف کو حق وباطل کا معیار اور انسانی گروہوں کی باہمی نفرت وعداوت کا موجب نہیں بننا چاہیے البتہ مذہب کی اصل بنیاد یعنی ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کو اس سے نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے قرآن نے تحمل ورواداری پر بہت زور دیا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس کی دعوت توحید کے خلاف جبر وتشدد سے کام لے رہے تھے۔ ان کی طرف سے بھی اسے معذرت کرنے میں تامل نہیں۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ص ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦: ١٠٨)

اور دیکھو جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں تم ان پر ظلم و ستم نہ کرو، کیونکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ لوگ بھی از راہ جہل و نادانی خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے یاد رکھو ہم نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ کو اپنا ہی عمل اچھا دکھائی دیتا ہے پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے اور وہیں ہر گروہ پر اس کے اعمال کی حیثیت کھلنے والی ہے۔

تجدید دعوت: ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام مذاہب کی اصل ایک ہی ہے اور سب کی بنیاد سچائی پر ہے تو پھر ظہور قرآن کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ گو تمام مذاہب سچے ہیں لیکن تمام مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب کو ان کی گمشدہ سچائی پر از سر نو جمع کر دیا جائے اور قرآن کا یہی کام ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سچائی اور دین سے پیروان مذاہب کی گمراہیاں اعتقادی اور عملی دونوں طرح کی تھیں اور ان گمراہیوں نے مختلف شکلیں اختیار کر لی تھیں ایک سب سے بڑی گمراہی جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے اسے "تشیع" اور "تحزب" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی ہیں الگ الگ جتھے بنا لینا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ (٦: ١٥٨)

جن لوگوں نے اپنے ہی دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ گئے تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ان کا معاملہ خدا کے حوالے ہے جیسے کچھ ان کے عمل رہے ہیں اس کا نتیجہ خدا انہیں بتلا دے گا۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ط كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ (٢٣: ٥٣)

پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا جدا دین بنا لیے ہر ٹولی کے پلے جو کچھ پڑ گیا ہے اسی میں مگن ہے۔

تشریح: تشیع اور تحزب کے الفاظ کہاں سے آئے اسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ خدا کے ٹھہرائے ہوئے دین کی حقیقت تو یہ تھی کہ وہ نوع انسانی پر خدا پرستی اور نیک عملی کی راہ کھولتا تھا۔ لیکن لوگوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا۔ اور انسانیت نسلوں، قوموں، ملکوں اور طرح طرح کی رسموں اور رواجوں میں بٹ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعتقاد وعمل کے بجائے سارا دارومدار اس پر آ کر ٹھہر گیا کہ کون کس کے جتھے اور گروہ میں داخل ہے۔ اور اسی کو صداقت دین کی کسوٹی بنا لیا گیا۔ گویا دین کی سچائی آخرت کا نتیجہ اور حق و باطل کا معیار تمام گروہ بندی اور گروہ پرستی اور ہر گروہ کا یقین کہ دوسروں پر نجات کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور وہی نجات کا مستحق ہے۔ اور فی الحقیقت دوسرے مذاہب کی نفرت نے خدا پرستی اور نیک عملی کی جگہ لے لی۔

قرآنی رویّہ:

قرآن کو گمراہی کا یہ طلسم توڑنا تھا چنانچہ اس نے انسان کی نجات و سعادت کا دارومدار کسی خاص گروہ، بندی پر نہیں بلکہ اعتقاد وعمل پر رکھا، اس نے اس بات پر زور دیا کہ نوع انسانی کے لیے دین الٰہی ایک ہی ہے اور اس راستے سے انحراف دین کی نفی ہے اس نے بتایا کہ اصل دین توحید ہے یعنی کسی واسطے کے بغیر ایک خدا کی براہ راست پرستش اور تمام بانیان مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے اس کے خلاف دین سے متخاصم ہونے والے جتنے عقائد و اعمال ہیں وہ خدا کے انکار کی تعریف میں آتے ہیں۔

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ

هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۲: ۱۱۱، ۱۱۲)

اور یہود و نصاریٰ نے کہا جنت میں کوئی انسان داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہودی اور نصاریٰ نہ ہو (یعنی جب تک یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو) یہ ان لوگوں کی جاہلانہ امنگیں ہیں (اے پیغمبر) ان سے کہہ دو اگر تم (اس زعم باطل میں) سچے ہو تو بتلاؤ تمہاری دلیل کیا ہے؟ ہاں بلاشبہ نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ مگر وہ کسی خاص گروہ بندی کی راہ نہیں ہوسکتی وہ تو ایمان و عمل کی راہ ہے) کسی نے بھی خدا کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو (خواہ کوئی ہو) وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائے گا۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۲: ۶۲)

جو لوگ پیغمبر اسلام پر ایمان لائے ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہو (کوئی بھی ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اور اس کے لیے کسی طرح کا کھٹکا نہیں ہے۔

یعنی قرآن کے الفاظ میں دین کسی گروہ بندی کا نام نہ تھا انسان کا تعلق کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے ہوا اگر وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اس کے اعمال بھی نیک ہیں یعنی اس کی زندگی نیک عملی کا نمونہ ہے تو دینِ الٰہی پر چلنے والا ہے اور اس کے لیے نجات ہے۔ لیکن یہودیوں اور عیسائیوں نے صرف اپنے لیے ایک خاص قسم کا ضابطۂ فکر و اخلاق بنا لیا۔

یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام ''یہودیت رکھ دیا۔ عیسائیوں نے بھی اپنے اطراف ایسا ہی ایک حلقہ بنالیا اور اس کو ''مسیحیت'' کا نام دے دیا اور ہر ایک نے یہی کہا کہ جو اس کے دائرے میں شامل ہے وہ سچائی پر ہے اور نجات اسی کے لیے ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ نجات سے قطعاً محروم ہے اور اس طرح ایمان باللہ اور نیک عملی کا عالمگیر تصور یک قلم غیر موثر ہو گیا۔ ایک شخص کتنا ہی خدا پرست اور نیک عمل ہو لیکن اگر وہ یہودیت یا ''مسیحیت'' کے دائروں میں داخل نہیں ہے۔ تو اسے کوئی یہودی یا عیسائی ہدایت یافتہ انسان نہیں سمجھے گا۔ لیکن ایک انتہائی بدعمل اور بد اعتقاد انسان بھی نجات یافتہ سمجھ لیا جائے گا اگر چہ وہ گروہ بندیوں کے اس نظام میں داخل ہے قرآن اس قسم کی گروہ بندیوں کو مسترد کر دیتا یہ وہ اعلان کرتا ہے کہ کوئی انسان ہو کسی نسل و قوم یا گروہ کا ہو اگر اس نے اللہ کے آگے عبودیت کا سر جھکایا اور نیک عملی کی زندگی اختیار کی تو اس نے نجات و سعادت پالی اور اس کے لیے کوئی غم اور کھٹکا نہیں مذہبی صداقت کی عالمگیر وسعت کا یہی وہ تصور ہے جو قرآن ظاہر کرتا ہے لیکن وہ افسوس کے ساتھ کہتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (٢ : ١١٣)

اور یہودیوں نے کہا عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے اسی طرح عیسائیوں نے کہا یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور دونوں کا سرچشمہ دین ایک ہی ہے، ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو مقدس نوشتوں کا علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب نے کہ وہ بھی صرف اپنے ہی کو نجات کا وارث سمجھتے ہیں) اچھا جس بات میں باہم گر جھگڑ رہے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ ان کا فیصلہ کر دے گا اور اس

وقت حقیقت حال سب پر کھل جائے گی۔

یہودیوں نے تو یہ انتہا کر دی تھی۔ کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ جہنم کی آگ انہیں چھو بھی نہیں سکتی۔لیکن قرآن صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ جس کسی نے بھی اچھا کام کیا اس کے لیے بھلائی ہے اور جس نے برا کام کیا اس کے لیے برائی ہے اور کسی مخصوص نسل یا شخص کی خاطر فطرت کا یہ قانون بدل نہیں سکتا۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○ (۲: ۸۱: ۸۲)

اور ان لوگوں نے یعنی یہودیوں نے کہا) ہمیں جہنم کی آگ کبھی چھونے والی نہیں اور اگر چھوئے بھی تو اس سے زیادہ نہیں کہ چند دنوں کے لیے چھوئے (اے پیغمبر) ان سے کہو یہ جو تم کہتے ہو تو کیا تم نے خدا سے کوئی قول و اقرار کرا لیا ہے اور وہ اب اپنے قول و اقرار سے پھر نہیں سکتا یا پھر تم خدا کے نام سے ایک ایسی (جھوٹی) بات کہہ رہے ہو۔ جس کا تمہیں کوئی علم نہیں؟ (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ کسی نسل اور کسی گروہ کا انسان ہو لیکن) جس کسی نے برائی کمائی اور اپنے گناہوں میں گھر گیا تو وہ دوزخی گروہ میں سے ہے ہمیشہ دوزخ میں رہنے والا اور جس کسی نے بھی ایمان کی راہ اختیار کی اور نیک عمل ہوا تو وہ بہشتی گروہ میں سے ہے ہمیشہ بہشت میں رہنے والا۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا○ (۴: ۱۲۳)

مسلمانو یا درکھو نجات اور سعادت نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب

کی آرزوؤں پر (خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جو کوئی بھی برائی کرے گا۔ اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا اور پھر نہ تو کسی کی دوستی بچا سکے گی نہ کسی کی طاقت کی مددگاری۔)

اس گروہ بندی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ یہودی سمجھتے تھے کہ کاروبار کی انجام دہی میں سچائی اور دیانت داری کے جتنے بھی احکام ان کے لیے نازل ہوئے ہیں۔ غیر یہودیوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت ان کی پابندی ضروری نہیں انہوں نے یہ خیال کر لیا تھا جو آدمی ہمارا ہم مذہب نہیں ہے تو ہمارے لیے روا ہے کہ جس طرح بھی چاہیں اس کے مال و جائداد کو ہضم کر لیں چنانچہ لین دین میں سود لینے کی ممانعت کو انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ دوسروں کے ساتھ اس اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو یہودی عرب میں آباد تھے وہ عربوں کے ساتھ اسی قسم کا طرزِ عمل رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عرب کے باشندے ان پڑھ اور بت پرست ہیں، ہم ان لوگوں کا مال جس طرح بھی کھا لیں ہمارے لیے جائز ہے۔

وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ (۴: ۱۶۱)

اور ان کا سود کھانا حالانکہ وہ اس سے روک دیئے گئے تھے اور ان کی یہ بات کہ لوگوں کا مال ناجائز طریقہ سے کھا لیتے تھے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ‌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝ بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝ (۳: ۷۰)

(یہودیوں کی) یہ (معاملگی) اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں عرب کے ان اَن پڑھ لوگوں سے (بدمعاملگی کرنے) میں ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی (جس طرح بھی ہم چاہیں ان کا مال کھا سکتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کہتے ہوئے وہ صریح اللہ پر افترا کرتے ہیں ہاں (ان سے باز پرس ہوگی اور ضرور ہوگی کیونکہ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ) جو کوئی اپنا قول و قرار

سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور برائی سے بچتا ہے تو وہی اللہ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور اللہ کو دوست رکھتا ہے۔

ایسا عقیدہ رکھنا خدا کے دین پر صریح افترا تھا خدا کا دین تو یہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے اور ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرنے میں راست بازی اور دیانت داری کو ملحوظ رکھنا چاہیے اس کا تعلق کسی عقیدہ یا گروہ سے کیوں نہ ہو۔

مذہبی گروہ بندیوں نے جن رسموں کو جنم دیا ہے ان میں سے ایک رسم وہ ہے جسے اصطباغ (بپتسما) کہتے ہیں یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا کی جاتی تھی جب کوئی گناہوں کا اعتراف اور ان سے توبہ کرتا تھا۔

لیکن عیسائیوں نے اسے ایک ذریعہ نجات بنا دیا قرآن اسے گمراہی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ محض ایک مقررہ رسم ادا کر دینے سے نجات و سعادت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ نجات و سعادت حاصل ہوتی ہے نیک عملی سے قرآن کہتا ہے کہ صرف پانی چھوانے سے اصطباغ نہیں ہوتا بلکہ اصطباغ یہ ہے کہ تمہارے دل خدا پرستی کے رنگ میں رنگ جائیں۔ قرآن کہتا ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۲:۱۳۸)

یہ اللہ کا رنگ ہے (یعنی دین الٰہی کا قدرتی اصطباغ ہے) اور کون ہو سکتا ہے ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب ایک ہی تھا اور کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کی مشترکہ میراث تھی لیکن دو مذہبی گروہوں میں بٹ جانے کی وجہ سے وہ باہم دگر مخالف اور مکذب ہو گئے تھے ایک دوسرے کو جھٹلاتے اور ہر جتھا صرف اپنے ہی جتھے کے لوگوں کو نجات و سعادت کا مالک سمجھتا تھا۔

جب دنیا اتنے گروہوں اور جتھوں میں بٹ گئی تھی اور ہر جتھا دوسرے جتھے کے مذہب کو جھٹلا رہا تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان سب کی اصل ایک ہی تھی تو یہ فیصلہ کون

کرتا کہ سچائی کا حقیقی نمائندہ کون ہے؟ قرآن کہتا ہے سچائی اصلاً سب کے پاس ہے مگر عملاً سب نے اسے کھو دیا ہے۔ سب کو ایک ہی دین دیا گیا تھا اور سب کے لیے ایک ہی عالمگیر قانون ہدایت تھا۔ لیکن سب نے اصل حقیقت ضائع کر دی اور ''دین'' یا راہ راست پر قائم رہنے کی جگہ ہر گروہ نے الگ الگ راستے اختیار کر لیے اور یہ سمجھ بیٹھا کہ سعادت و نجات کا وہی مستحق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہدایت کا راستہ سب کے لیے کھلا ہے اور کسی خاص نسل یا قوم کے لیے مختص نہیں ہے۔

باب ششم

وَحدت انسانی

جن لوگوں نے خدا کے نام پر اپنے آپ کو الگ الگ مذہبی گروہوں میں بانٹ لیا تھا ان کے بارے میں قرآن کا یہ انتباہ تھا کہ "کیا اپنے پرودگار کے سامنے وہ تم سے جھگڑتے رہیں گے"۔

اگر خدا پر سچے دل سے ایمان لایا جائے تو عمل کی زندگی میں یہ ایمان انسانی اخوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی قرآن کا پیام تھا اور اس نے یہودیوں عیسائیوں اور پیغمبر کے زمانے کے عرب مشرکین کو یہی پیام دیا تھا۔ اس کی اصل تبلیغ یہ تھی۔ کہ سارے گروہ اور مذہبی جتھے پھر ایک جگہ آ جائیں اور بنی نوع انسان کی عظیم تر اخوت کا راستہ ہموار کریں، مولانا آزاد نے قرآن کے مطالعہ سے اسی پیام کا استخراج فرمایا ہے۔

قرآن نے اخوت انسانی کا جو لائحہ عمل دیا ہے اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ ابتدا میں نوع انسانی ایک ہی جمعیت تھی جو سارے انسانوں کے ایک خدا پر ایمان رکھتی ہے اور اسی ایمان کے مطابق شروع میں تمام انسانوں نے دین یا زندگی کا ایک ہی راستہ اختیار کیا تھا۔ سابقہ باب میں بتایا گیا ہے کہ کس شدت کے ساتھ قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ زندگی کی یہ راہ سب کے لیے ایک ہی ہو سکتی ہے اور اسی اصول کے تحت اس زمانے کے یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں کو مخاطب کیا ہے ان سب میں یہ بات قدر مشترک تھی۔ کہ وہ

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کو اپنے مشترکہ مورث اعلیٰ کا مرتبہ دیتے تھے۔ اور یکساں طور پر ان کا احترام کرتے تھے۔ پس قرآن ان کے سامنے ایک نہایت سیدھا سا راستہ پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر ہر ایک کے دین کی سچائی اس کے اپنے گروہ کے ساتھ وابستہ ہے تو بتلاؤ کہ یہ سب کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کس گروہ کے آدمی تھے ان کے زمانے میں نہ تو یہودیت کا ظہور ہوا تھا اور نہ مسیحیت کا تو پھر ان کا کون سا راستہ یا دین تھا۔

يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ التَّوْرَىٰةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعْدِهِۦٓ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۳: ۶۵)

اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تورات اور انجیل نازل نہیں ہوئیں مگر اس کے بعد پھر اتنی صاف بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِى قَالُوا۟ نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ ءَابَآئِكَ إِبْرَٰهِمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ إِلَٰهًا وَٰحِدًا وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ (۲: ۱۳۳)

پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی تھی اور س نے اپنی اولاد سے پوچھا تھا، بتلاؤ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ انہوں نے جواب میں کہا تھا اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جس کی تو نے عبادت کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نے کی ہے اور ہم خدا کے حکموں کے فرمانبردار ہیں۔

وَقَالُوا۟ كُونُوا۟ هُودًا أَوْ نَصَٰرَىٰ تَهْتَدُوا۟ ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۲: ۱۳۵)

اور یہودی کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے نصاریٰ کہتے ہیں نصرانی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے اے پیغمبرؐ تم کہو نہیں۔ اللہ کی عالمگیر ہدایت تمہاری ان گروہ بندیوں کی پابند

نہیں رہ سکتی! ہدایت کی راہ تو وہ حنفی راہ ہے جو ابراہیمؑ کا طریقہ تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اس طرح قرآن نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہودی، عیسائی اور مغربی ایشیاء کی دوسری اقوام اپنے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ کے زمانہ میں جس دین کے پیرو تھے وہ نہ یہودیت تھا نہ مسیحیت اور نہ کسی اور مذہبی حلقہ بندی سے اس کا تعلق تھا۔ یہودیت اور مسیحیت تو حضرت موسیٰ اور حضرت مسیحؑ کے نام سے چلی جن کا ظہور حضرت ابراہیم کے کئی سو سال بعد ہوا تھا اور حضرت ابراہیمؑ نے نجات کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ صرف کسی مخصوص گروہ کے لیے نہ تھا بلکہ پوری انسانیت کے لیے اور وہ ایک ہی خدا کی پرستش اور نیک عملی کا راستہ تھا قرآن کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور دوسرے تمام پیغمبروں نے دنیا کو جو پیام دیا وہ یہی تھا کہ پوری نوع انسانی ایک ہی امت ہے اور سب کا ایک ہی پروردگار ہے پس چاہیے کہ سب اسی ایک ہی پروردگار کی بندگی کریں اور ایک کنبہ کے افراد کی طرح رہیں قرآن نے پچھلے رسالوں اور مذاہب کے بانیوں کے مواعظ نقل کیے ہیں یہ بتانے کے لیے کہ ان سب نے دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی تعلیم دی ہے لیکن قرآن افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ:

فَتَقَطَّعُوا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۵۵: ۳۳)

لیکن لوگوں نے یہ تعلیم فراموش کر دی اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنالیں اب ہر ٹولی اس میں مگن ہے جو اس کے پلے پڑ گیا ہے۔

قرآن کی دعوت: مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ قرآن نے کسی اور بات پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا کہ اس نظریہ حیات پر اس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی مذہبی گروہ بندی کے حق میں نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چاہتا ہے۔ کہ تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے اور سب کو سچائی کی ایک راہ پر جمع کر

دے جس کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ روز اول سے موجود ہے اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اسی کی طرف بلایا ہے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ (۴۲: ۱۳)

اور (دیکھو) اس نے تمہارے لیے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (۴: ۱۶۳)

(اے پیغمبر) ہم نے تمہیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے جس طرح نوحؑ کو کیا تھا اور ان (تمام نبیوں کو کیا تھا) جو نوح کے بعد ہوئے نیز جس طرح ابراہیم، اسمٰعیل اسحٰق، یعقوبؑ، اولاد یعقوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، سلیمانؑ، (وغیرہ) کو مخاطب کیا اور داؤد کو زبور عطا کی، علاوہ بریں وہ رسول جن میں سے بعض کا حال ہم تمہیں پہلے سنا چکے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کا حال تمہیں نہیں سنایا

سورۃ انعام رکوع (۲) میں پچھلے رسولوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے ان الفاظ پیغمبر اسلام محمد ﷺ کو مخاطب کیا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۶: ۹۰)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہ حق دکھائی پس (اے پیغمبر) تم بھی انہیں کی ہدایت

کی پیروی کرو۔

تمام بانیاں مذاہب کے پیرووں کو ایک ہی راستے پر لانے کے لیے قرآن نے تمام بانیاں مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق فرمائی ہے اور ان کے راستے کو راہ حق بتایا ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (۳: ۸۴)

اے پیغمبر کہہ دو ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لائے ہیں نیز جو کچھ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰق، یعقوبؑ، اور اولاد یعقوبؑ پر نازل ہوا ہے ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے دیا گیا ہے سب پر ہمارا ایمان ہے ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ اسے نہ مانیں دوسروں کو مانیں) اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں (اس کی سچائی جہاں کہیں بھی اور جس کسی کی زبانی بھی آئی ہو اس پر ہمارا ایمان ہے)۔

اوپر کی آیت کے یہ الفاظ کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کرتے۔ قرآن میں متعدد موقعوں پر آئے جس کا منشا یہ ہے کہ ایک رسول کو دوسرے رسول سے برتر سمجھنے ایک کو پیغمبر ماننے اور دوسرے کو حق نہ جاننے کے رجحان سے انکار کیا جائے قرآن کہتا ہے، ہر انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں اور ان پر نازل کیے تمام صحائف پر اور ان کی بنیادی صداقت پر ایمان لائے اور یہ سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی ہو اور جس زبان میں بھی ظاہر ہوئی ہو اسے قبول کرے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (۲ : ۲۸۵)

اللہ کا رسول اس (کلامِ حق) پر یقین رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں یہ سب اللہ پر اس کے ملائکہ پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) انہوں نے کہا خدایا ہم نے تیرا پیام سنا اور تیری فرمانبرداری کی ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو۔ ہم سب کو بالآخر تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی سچائی اس کی عالمگیر بخشش ہے وہ نہ تو کسی خاص نسل و قوم سے متعلق ہے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے اور نہ کسی خاص زبان میں اس کا نزول ہوا ہے انسان اپنے لیے جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں قائم کر لیتا ہے لیکن خدا کی سچائی کو اس طرح بانٹا نہیں جا سکتا اس سچائی کی نہ تو کوئی قومیت ہے۔ نہ نسل ہے نہ جغرافیائی حد بندی ہے اور نہ جماعتی حلقہ بندی، وہ خدا کے پیدا کیے ہوئے سورج کی طرح کرہ ارض کے ہر گوشے پر ضیا پاشی کرتی ہے اور ہر ایک کو یکساں روشنی بخشتی ہے وہ ہر جگہ نمودار ہوتی ہے اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ خدا کی سچائی جہاں کہیں بھی پائی جائے اور جس بھیس میں بھی پائی جائے انسان کی بہت بڑی متاع ہے اور انسان اس کا وارث ہے۔

قرآن نے جا بجا تفریق "بین الرسل" کی راہ کو خدا کے دین سے انکار کی راہ قرار دیا ہے۔ پس انسان کے لیے دو ہی راستے ہیں ایک نبیوں کے ماننے کا راستہ اور دوسرا سب کے انکار کا راستہ، کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے، کسی ایک رسول کا انکار بھی سب کے انکار کا حکم رکھتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًاo اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ج وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّہِیْنًاo وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْہُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْہِمْ اُجُوْرَہُمْ ط وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاo (۴: ۱۵۰: ۱۵۲)

جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں سے برگشتہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفرقہ کریں (یعنی کسی کو خدا کا رسول مانیں کسی کو نہ مانیں) اور کہتے ہیں ان میں سے بعض کو ہم مانتے ہیں بعض کا انکار کرتے ہیں اور پھر اس طرح چاہتے ہیں کفر و ایمان کے درمیان کوئی تیسرا راستہ اختیار کر لیں تو یقین کرو یہی لوگ ہیں کہ ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں اور جن لوگوں کی راہ کفر کی راہ ہے تو ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار ہے لیکن ہاں جو لوگ اللہ اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے اور کسی ایک پیغمبر کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کیا، تو بلاشبہ یہی لوگ ہیں جنہیں عنقریب اللہ ان کو اجر عطا فرمائے گا اور وہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

سورۂ بقرہ میں جو قرآن کی دوسری سورت ہے سچے مومنوں کی راہ بتلائی گئی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ہُمْ یُوْقِنُوْنَ o اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنْ رَّبِّہِمْ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲: ۴:۵)

اور وہ لوگ جو سچائی پر ایمان لائے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہے اور ان تمام سچائیوں پر جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اور نیز آخرت کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی ہدایت پر ہیں اور یہی ہیں جنہوں نے فلاح پائی۔

قرآن اس بات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ وہ لوگ بھی جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام

کارخانۂ ہستی کا خالق ہے اور اسی کی پروردگاری ہر مخلوق کی پرورش کر رہی ہے اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ اس کا دیا ہوا روحانی سچائی کا قانون بھی ایک ہے اور ایک ہی طور پر تمام نوع انسانی کو دیا گیا ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵ : ۵۹)

ان لوگوں سے کہو کہ اے اہل کتاب تم جو ہماری مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے ہو تو بتلاؤ اس کے سوا ہمارا جرم کیا ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو اس سے پہلے نازل ہوا ہے سب پر ایمان رکھتے ہیں (پھر کیا خدا پرستی) اور خدا کے تمام رسولوں کی تصدیق کرنا تمہارے نزدیک جرم اور عیب ہے (افسوس تم پر) تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو راہ حق سے یکسر برگشتہ ہیں۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۱۹ : ۳۶)

دیکھو خدا تو میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے پس اس کی بندگی کرو یہی دین کی سیدھی راہ ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝ (۲ : ۱۳۹)

(اے پیغمبران سے) کیا تم خدا کے بارے میں ہم سے جھگڑا کرتے ہو حالانکہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار وہی ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں تمہارے لیے تمہارے اعمال یعنی ہر انسان کو اس کے عمل کا نتیجہ ملنا ہے پھر اس بارے میں جھگڑا کیوں کرتے ہو۔

اس موقع پر بات قابل لحاظ ہے کہ اوپر کی آیات میں جہاں کہیں اس طرح کے

مخاطبات ہیں جیسے اِنَّ اللّٰہ رَبِّي وَرَبُّكُم (اللہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے) الٰهنا والٰهكم واحد (ہمارا اور تمہارا دونوں کا خدا ایک ہی ہے) ولنا اعمالنا ولكم اعمالكم (اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے لیے تمہارے عمل اس قسم کے تمام مخاطبات سے قرآن کا مقصود اس حقیقت پر زور دینا ہے کہ سب کا پروردگار ایک ہے اور ہر انسان کے لیے ویسا ہی نتیجہ ہے جیسا اس کا عمل ہے اسی لیے قرآن پوچھتا ہے تو پھر خدا اور مذہب کے نام پر یہ عالمگیر جنگ و جدال کیوں برپا ہے وہ بار بار کہتا ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسان کو خدا پرستی اور نیک عملی کی طرف بلاتا ہے وہ کسی مذہب کو نہیں جھٹلاتا اور نہ کسی بانی مذہب کا انکار کرتا ہے۔ وہ سب بانیان مذاہب کی یکساں تصدیق کرتا ہے اور سب کی مشترکہ تعلیم اس کا دستور العمل ہے پھر جب اس کا پیام یہ ہے تو قرآن پوچھتا ہے کہ تمام پیروان مذہب نے کیوں اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ قرآن نے کبھی کسی مذہب کی پیروی کرنے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اسے ایک نئے دین کے طور پر مان لیں بلکہ وہ ان سے یہی کہتا ہے کہ اپنے اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر جسے انہوں نے طرح طرح کی تحریفوں اور اضافوں سے مسخ کر دیا ہے سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائیں وہ کہتا ہے کہ اگر انہوں نے ایسا کر لیا تو اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ کیونکہ جونہی وہ اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم کی طرف لوٹیں گے۔ ان کے سامنے وہی حقیقت آموجود ہوگی۔ جس کی طرف قرآن بلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے بلکہ وہی قدیم پیام ہے جو تمام بانیان مذاہب دے چکے ہیں۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا

وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝(۵: ۶۸:۶۹)

اے اہل کتاب جب تک تورات اور انجیل کو اور ان تمام صحیفوں کو جو تم پر نازل ہوئے ہیں حقیقتاً قائم نہ کرو اس وقت تک تمہارے پاس دین میں سے کچھ نہیں ہے اور اے پیغمبر تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہتوں کا کفر و طغیان اس کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ جائے گا تو جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کی ہے تم ان کی حالت پر بے کار کو غم نہ کھاؤ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں جو یہودی ہیں جو صابی ہیں جو نصاری ہیں (یہ ہوں یا کوئی ہو) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے عمل نیک ہوئے تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذاہب کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی البتہ وہ کہتا ہے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے غالب تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے حقیقی مذہب کے راستے سے منحرف ہو گئے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۝ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝(۳: ۱۱۴:۱۱۵)

یہ بات نہیں ہے کہ سب ایک ہی طرح کے ہوں انہیں اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اصل دین پر قائم ہیں وہ تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان

کے سراس کے سامنے جھکے ہوتے ہیں اور وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں نیکی کی راہوں میں تیز گام ہیں اور بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو نیک انسانوں میں سے ہیں اور یاد رکھو یہ لوگ جو کچھ نیکی کا کام کرتے ہیں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی قدر نہ کی جائے وہ جانتا ہے کہ کس گروہ میں کون پرہیز گار ہے۔

مِنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا يَعۡمَلُوۡنَ ۝ (۵:۶۶)

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رو ہیں لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں۔ برا ہی کرتے ہیں یہ جو قرآن جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جھٹلانے والا نہیں اور ان کے پیروؤں سے کہتا ہے کہ قرآن پر ایمان لاؤ تو اس سے مقصود بھی اسی حقیقت پر زور دینا ہے کہ ایمان اور مقدس نوشتوں کے خلاف قرآن کوئی نیا دین نہیں پیش کرتا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے ادیان سے منحرف ہو جائیں بلکہ فی الحقیقت انہیں اپنے اپنے اصل دین پر مضبوطی سے جمے رہنے کی تاکید کرتا ہے اور اسی لیے تعجب کے ساتھ پوچھتا ہے کہ "پھر کیوں وہ قرآن کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں یا اس سے جھگڑتے ہیں؟

اسی لیے قرآن نے نیکی کے واسطے معروف کا اور برائی کے واسطے منکر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وَأْمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ (۳۱:۱۷)

معروف کا لفظ "عرف" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں جانی پہچانی بات کو پہچاننا اور "منکر" کے معنی ہیں ایسی بات جس سے عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ قرآن نے ان الفاظ کو خاص طور پر اس لیے اختیار کیا ہے کہ انسانوں کے افکار و عقائد میں چاہے کسی قسم کے اختلافات کیوں نہ ہوں کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب متفق ہیں اور جن کے برے ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ مثلاً اس بات میں سب متفق ہیں کہ سچ بولنا اچھا ہے

اور جھوٹ بولنا برا ہے اس پر سب کو اتفاق ہے کہ دیانتداری اچھی بات ہے۔ بددیانتی بری اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت ہمسایہ سے سلوک، مسکینوں کی خبر گیری اور مظلوموں کی امداد اچھی باتیں ہیں اوران کے بارے میں کوئی مختلف نظریہ نہیں رکھتا دنیا کے تمام اخلاق دنیا کی تمام حکمتیں اور دنیا کی تمام جماعتیں دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں لیکن جہاں تک ان اچھائیوں کا تعلق ہے سب ہم آہنگ اور ہم رائے ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ جب (معروف نیکی کا حکم دیتا ہے اور منکر برائی) سے منع کرتا ہے تو اس کی مخالفت کیوں ہو؟

فطرت اللہ : قرآن کہتا ہے کہ یہی راہ عمل جو اس نے مقرر کی ہے، دوسرے قوانین فطرت کی طرح نوع انسانی کے لئے ایک قانون فطرت ہے اگر تم اس سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس پر چلو۔ یہ خدا کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہی فطری دین ہے ایسا قانون ہے جس میں کسی کے لیے تبدیلی نہیں ہوتی ایسا دین ہے جسے تمام انبیاء نے اختیار کیا اور تبلیغ کی یہی وہ مذہب ہے جس کو قرآن ''اسلام'' کا نام دیتا ہے یعنی خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین حیات کی فرمانبرداری کا راستہ۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ ٥ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰: ۳۰:۳۲)

تم ہر طرف سے منہ پھیر کر الدین کی طرف رخ کرو یہی خدا کی بناوٹ ہے۔ جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی یہی ''الدین القیم'' یعنی سیدھا اور سچا دین ہے لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو نہیں جانتے (دیکھو) اسی (ایک خدا

) کی طرف متوجہ رہو۔ اس کی نافرمانی سے بچو نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور گروہ بندیوں میں بٹ گئے ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے۔

یہی وہ اسلام ہے جس کا پیام زمانہ دراز سے تمام انبیائے کرام دیتے آئے یہی سچا دین یا خدا کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے قرآن نے سورۃ فاتحہ میں اسی کو صراط مستقیم سے تعبیر کیا ہے جس پر چل کر افراد یا جماعتیں زندگی میں کامیابی یا نیکی پاتی ہیں یعنی قرآن کے الفاظ میں انہیں خدا کا انعام حاصل ہوتا ہے اور اس راستے سے منحرف ہونے والے نابود ہو جاتے ہیں یا ان پر خدا کا غضب کا نازل ہوتا ہے اگر وہ مختلف گروہ جن میں بنی نوع انسان نے اپنے آپ کو بانٹ لیا ہے خدا پرستی اور نیک عملی کے راستے پر لوٹ آنے کا تہیہ کر لیں جو سب کے یہاں اصل دین ہے اور رفتار زمانہ نے ان اصولوں میں جو انحراف اور گمراہی پیدا کر دی ہے اس سے باز آ جائیں تو قرآن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ٥ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ٥ (۳:۱۸)

اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے اور جو اہل کتاب نے اختلاف کیا اور ایک دین پر مجتمع رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں بٹ گئے تو یہ اس لیے ہوا کہ اگرچہ علم حقیقت کی راہ ان پر کھل چکی تھی لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف

میں پڑ گئے اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے تو اللہ کا قانون مکافات بھی حساب لینے میں سُست رفتار نہیں پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں تو تم کہو میری اور میرے پیروؤں کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینا اور ہم نے سر جھکا دیا ہے۔ پھر اہل کتاب سے اور ان پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکین عرب سے) پوچھو تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑ دو یہ بتلاؤ تمہیں خدا پرستی منظور ہے یا نہیں اگر وہ جھک گئے تو (سارا جھگڑا ختم ہوگیا اور) انہوں نے راہ پالی اگر روگردانی کریں تو تمہارے ذمے جو کچھ ہے وہ پیام حق پہنچا دینا ہے اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں ہے۔

قرآن کہتا کہ دین کی حقیقت ہے کہ خدا نے جو قانون فطرت انسان کے لیے ٹھہرا دیا ہے اسی کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے درحقیقت تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے اگر عالم تخلیق ذرہ برابر بھی اس راستے سے انحراف کرے تو سارا کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۸۳:۳)

پھر کیا چاہتے ہیں اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈھ نکالیں حالانکہ آسمان وزمین میں جو کوئی بھی ہے سب چارو ناچار اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون عمل کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور بالآخر سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ ''الاسلام'' یا اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے کا راستہ ہی خدا کا دین ہے اور ہر رسول نے اسی دین کی تبلیغ فرمائی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی دین یا راستہ گروہ بندی یا تفرقہ اندازی پر مبنی ہوگا اور خدا کا عالمگیر دین نہ

ہوگا۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَفِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۸۵:۳)

اور جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی اور وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام پیروان دعوت کو بار بار متنبہ کیا ہے کہ دین میں تفرقہ اندازی اور گروہ بندی سے بچیں اور اسی گمراہی میں نہ مبتلا ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے وہ کہتا ہے میری دعوت نے ان تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے خدا پرستی کی راہ میں اسی طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے ایک دوسرے کے جان نثار بن گئے یہودی، عیسائی مجوسی اور صابی ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا اور اب یہ سب ایک دوسرے کے بانیان مذاہب کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۱۰۳:۳)

اور (دیکھو) سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اللہ نے تم پر فضل و کرم کیا ہے اسے یاد کرو تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہمدگر الفت پیدا کر دی پھر ایسا ہوا کہ انعام الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے (اور (دیکھو) تمہارا حال یہ تھا گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے اور اس کے کنارے کھڑے

ہو لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ ہدایت پاؤ۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ٥ (۳:۱۰۵)

اور دیکھو ان لوگوں کی سی چال اختیار نہ کر لینا جو ایک دین پر قائم رہنے کی جگہ جدا ہو گئے اور اختلاف میں پڑ گئے باوجود یکہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آ چکی تھیں (یاد رکھو) یہی لوگ ہیں جن کے لیے (کامیابی وفلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔

وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٥ (۶:۱۵۵)

پس اسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گی یہی بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم نافرمانی سے بچو۔

قرآن سے بنائے نزاع:

اس بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے مولانا آزاد اس نزاع کی نوعیت بیان کرتے ہیں۔ جو پیغمبر اسلام کے زمانے میں قرآن اور اس کے مخالفین میں پیدا ہو گئی تھی جو ان دوسرے مذاہب کے پیرو تھے جو عرب میں جاری تھے ان میں سے بعضوں کے پاس آسمانی صحائف بھی تھے تو سوال یہ ہے کہ کیا قرآن نے ان مقدس صحیفوں سے انکار کیا تھا؟ کیا اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا کی سچائی کا وہی علمبردار ہے اس لیے تمام لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے نبیوں سے برگشتہ ہو جائیں کیا اس نے کوئی ایسی نئی اور انوکھی بات پیش کی تھی جس کے ماننے میں قدرتی طور پر انہیں تامل تھا؟ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی، قرآن نے نہ صرف ان تمام بانیاں مذاہب کی تصدیق کی جن کے نام لیوا اس

کے سامنے تھے بلکہ صاف صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آ چکے ہیں میں سب کی تصدیق کرتا ہوں اس نے کسی مذہب میں کوئی فرق و امتیاز قائم نہیں کیا اور کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کردے بلکہ اس کے برعکس یہی کہا اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم یعنی ایک خدا پر ایمان اور نیک عملی کی راہ پر کاربند ہو جاؤ کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل یہی تھی۔ اس نے نہ تو کوئی نیا اصول حیات پیش کیا نہ کوئی انوکھا عمل بتایا اس نے صرف انہیں باتوں پر زور دیا جو دنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بوجھی باتیں رہی ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح، اس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا تو یہی کہا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سر نو تازہ کرلو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہو۔ اور ایسا کرنا ہی گویا قرآن کے پیغام کو قبول کر لینا تھا۔

پھر آخر قرآن کی مخالفت کا سبب کیا تھا۔ قریش مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ اس نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بت پرست نہیں تھے اور عیسائی کیوں برسر پیکار ہو گئے۔ جنہوں نے بت پرستی کی حمایت نہیں کی تھی؟ اصل یہ ہے کہ ہر مذہب کے پیروں کی خواہش یہ تھی کہ قرآن اپنے حریف مذاہب کی تعلیمات کو جھٹلائے اور چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا تھا اس لیے کوئی بھی اس سے خوش نہ تھا بلا شبہ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کرتا تھا لیکن چونکہ وہ ساتھ ہی حضرت مسیحؑ کی بھی تصدیق کرتا تھا اس لیے یہودیوں نے اس کی مخالفت ضروری سمجھی عیسائی اس بات پر خوش تھے کہ قرآن حضرت مسیحؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی پاکی و صداقت کا اعلان کرتا ہے لیکن وہ اس سے ناراض تھے کہ قرآن یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کفارہ و اصطباغ پر، عیسائیوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی اسی طرح قریش مکہ کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ

قرآن حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کی بزرگی کا احترام کرتا ہے۔ کیونکہ وہ انہیں کی نسل سے تھے۔ لیکن وہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے کہ اسی کے ساتھ یہودی پیغمبروں کا بھی احترام کیا جائے جو ان کی نسل سے نہ تھے۔

مختصراً یوں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کے تین نمایاں اصول ایسے تھے جو اس وقت عرب میں مروجہ مذاہب کے پیروؤں کی ناراضگی کا باعث بنے۔

پہلے تو یہ کہ قرآن مذہبی گروہ بندی کا مخالف تھا اس نے دین کی وحدت کا اعلان کیا اگر اس بات کو مان لیا جاتا تو ان کو تسلیم کرنا پڑتا کہ دین کی سچائی کسی ایک ہی گروہ کے حصے میں نہیں آئی ہے۔ سب کو یکساں طور پر ملی ہے لیکن اس بات کو ماننا ان کی گروہ پرستی پر شاق گزرتا تھا۔

دوسرے یہ کہ قرآن کہتا تھا نجات وسعادت کا دارومدار اعتقاد عمل پر ہے نسل وقوم گروہ بندی اور ظاہری رسم ورواج پر نہیں ہے اگر اس اصول کو وہ تسلیم کر لیتے تو پھر نجات کا دروازہ بلا امتیاز تمام انسانی نسل پر کھل جاتا لیکن اس بات کے لیے ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

اور تیسرے یہ کہ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اصل دین خدا پرستی ہے یعنی کسی درمیانی واسطے کے بغیر براہ راست ایک خدا کی پرستش کی جائے لیکن اس وقت کے دوسرے پیروان مذاہب نے خدا پرستی کے نام پر کسی نہ کسی شکل میں شرک و بت پرستی کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ گو انہیں اس بات سے انکار نہ تھا کہ اصل دین بلا واسطہ خدا کی پرستش ہے لیکن اپنے مالوف اور موروثی طریقوں سے دستبردار ہونا انہیں شاق گزرتا تھا۔

خلاصہ بحث:

نزول قرآن کے وقت مذہبی شعور مختلف اقوام عالم کے جتھ بندی کے شعور کے آگے نہ بڑھا تھا، ہر مذہبی گروہ اس بات کا مدعی تھا کہ صرف اسی کا مذہب سچا مذہب ہے اور جو آدمی اس کے مذہبی حلقہ میں داخل ہے۔ وہی نجات کا مستحق ہے، صداقت کا معیار اور مذہب کی اصل حقیقت محض اس کے ظاہری اعمال و رسوم تھے۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کی رسوم کسی خاص قسم کے طعام کا کھانا یا کسی خاص وضع قطع اور لباس کا اختیار کرنا یا نہ کرنا چونکہ یہ ظاہری اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے اس لیے ہر مذہب کا پیرو اسی بنیاد پر دوسرے مذہبی گروہ کے پیرو کو صداقت سے خالی سمجھتا تھا۔ ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ سچائی پر ہے بلکہ یہ بھی تھا کہ دوسرے گروہ کا مذہب جھوٹا ہے، اس رویہ کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ خدا کے نام پر آپس میں نفرت و خانہ جنگی اور خونریزی کا بازار گرم رہتا تھا۔

قرآن نے دنیا کے سامنے تمام مذاہب کی عالمگیر وحدت کا اصول پیش کیا اس نے کہا جس طرح قوانین فطرت کائنات ہستی کے نظام کو برقرار رکھتے ہیں اسی طرح زندگی کا ایک روحانی قانون بھی ہے جو حیات انسان پر حاوی ہے اور یہ قانون سب انسانوں کے لیے یکساں ہے اس نے بتایا کہ سب سے بڑی گمراہی جس میں بنی نوع انسانی مبتلا ہوئی یہ تھی کہ اس نے اس قانون فطرت کو فراموش کر دیا اور الگ الگ گروہ بندیاں کرلیں زندگی کے اس روحانی قانون یا دین الٰہی کا اولین مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو متحد رکھے اور اس میں تفرقہ و نزاع نہ پیدا ہو۔ لیکن انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے اتحاد کی اس متاع گراں بہا یعنی مذہب کو تفرقہ اندازی کا ہتھیار بنا دیا۔

قرآن کے ظہور کا مقصد اصل مذہب اور اس کے ظاہری شوارع میں امتیاز کرنا تھا اصل مذہب کو اس نے دین سے تعبیر کیا ہے اور دوسری چیز کو شرع اور منہاج بتایا۔ ایک دین

ایک ہی ہے اور ہر زمانہ میں سب کو ایک ہی طرح سے دیا گیا ہے۔ البتہ شرع ومنہاج میں اختلاف ہے اور یہ اختلافات ظاہر ہوئے پس شرع ومنہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو سکتے اور قرآن نے اسی حقیقت پر پورا زور دیا ہے۔ قرآن کا شکوہ یہ تھا کہ دین کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ اور شرع ومنہاج یا ظاہری شوارع کو اصل مقصد قرار دے لیا گیا ہے اور یہی چیز انسانوں کے باہمی اختلافات کی بنیاد بن گئی ہے۔

قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں لیکن ان مذاہب کے پیرو سچائی سے منحرف ہو گئے اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی یعنی خدائے واحد کی پرستش اور نیک عملی کے راستے کو پھر سے اختیار کر لیں تو قرآن کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اور گو اس راستے کے اختیار کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس راہ پر چلنے والوں نے گویا قرآن کو قبول کر لیا۔ یہ تمام مذاہب کی مشترکہ سچائی کو قرآن نے ''الدین'' یا ''الاسلام'' کا نام دیا ہے، وہ کہتا ہے کہ خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ انسانوں کے درمیان تفریق پیدا کی جائے بلکہ اس کے برعکس اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسانوں کے درمیان باہمدگر اخوت ورفاقت پیدا ہو اور سب ایک ہی پروردگار کے رشتہ عبودیت سے منسلک ہو کر اخوت کے ساتھ رہیں۔

مذہبی گروہ بندی کی لعنت آج بھی دنیا کے ہر گوشے پر مسلط ہے لیکن اس لعنت سے نجات کس طرح حاصل کی جائے؟ یہ خرابی اس لیے انسانوں میں سرایت کر گئی کہ مذہب کی اصل رُوح کو نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہے۔ اب یہ کام تمام مذہبی گروہوں کی پیروی کرنے والوں کا ہے کہ وہ اپنے قدموں کے کھوئے ہوئے نشانوں کا پھر سے سراغ لگائیں اور ہر مذہب کی بنیادی تعلیم یعنی دین کے راستے پر گامزن ہو جائیں اگر یہ کام کر لیا گیا تو قرآن کہتا ہے۔ تمام نزاعات ختم ہو جائیں گے۔

اور ہر شخص یہ محسوس کرنے لگے گا کہ تمام مذاہب کا راستہ ایک ہی ہے یعنی وہ ایک دین جو پوری بنی نوع انسان کے لیے ہے اور جسے قرآن نے الاسلام کا نام دیا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے۔ ''امن وسلامتی'' کا راستہ یعنی خدا پرستی اور نیک عملی یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر نوع انسانی کی باہمی یگانگت کے ٹوٹے رشتوں کو جوڑا جا سکتا ہے یا اس تصور کو پھر سے زندہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ سب انسانوں کا ایک ہی پروردگار ہے۔ ہم سب کو ایک ہو کر اسی کی بندگی کرنی چاہیے اور اسی کے آگے سر جھکانا چاہیے تا کہ ہمارے تمام آپسی نزاعات ختم ہو جائیں جو ہم نے اپنے ہاتھوں پیدا کر لیے۔ قرآن کا یہی پیام تھا جو محمد ﷺ کے زمانے میں تمام مذاہب اور ادیان کے پیرووں کو دیا گیا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (۳:۶۴)

اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر (مسلم) ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا (اپنا معبود نہ بنائے)۔

جمعیت انسانی کو متحد کرنے کے لیے قرآن ایک وفاقی اصول پیش کرتا ہے، یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی قسم کی شرع ومنہاج یا ایک ہی طرح کے ضابطہ وقانون یا ایک ہی قسم کی طریق عبادت کے ذریعہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دیا جاتا اس لیے قرآن صرف اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ انسانی معیشت کو ایک ایسی بنیاد پر کھڑا کرو کہ دنیا کی مختلف اقوام، خدائے واحد کی پرستش کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ اخوت ورفاقت کے رشتے میں منسلک رہ سکیں اور ایک خاندان کے ارکان کی طرح نیک عملی کی راہ پر چل کر زندگی سے افادہ وفیضان حاصل کر سکیں، ایک حدیث میں بنی نوع انسان کی اس

برادری کو ایک خدا کا کنبہ یا گلے سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں ہر فرد کی حیثیت ایک دوسرے کے لیے گلہ بان کی ہوگی اور ہر ایک پورے گلہ کی بھلائی ونگہبانی کا ذمہ دار ہوگا۔ نزول قرآن کو تیرہ سو سال سے زیادہ ہو چکے لیکن قرآن نے جو پیام اس وقت دیا تھا آج بھی وہ اپنی جگہ پر قائم اور اٹل ہے۔

☆☆ OOO ☆☆
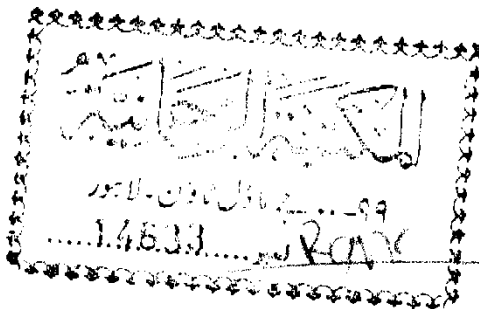
ہماری دیگر کتب

کتاب	مصنف
اُم الکتاب (تفسیر سورہ فاتحہ)	مولانا ابوالکلام آزاد
غبارِ خاطر	مولانا ابوالکلام آزاد
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد
قرآن کا قانون عروج وزوال	مولانا ابوالکلام آزاد
قول فیصل	مولانا ابوالکلام آزاد
خطبات آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد
ارکان اسلام	مولانا ابوالکلام آزاد
مسلمان عورت	مولانا ابوالکلام آزاد
حقیقت صلوٰۃ	مولانا ابوالکلام آزاد
ولادت نبوی ﷺ	مولانا ابوالکلام آزاد
مسئلہ خلافت	مولانا ابوالکلام آزاد
صدائے حق	مولانا ابوالکلام آزاد
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد
رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے آخری لمحات	مولانا ابوالکلام آزاد
آزادی ہند	مولانا ابوالکلام آزاد
افسانہ ہجر ووصال	مولانا ابوالکلام آزاد
مولانا آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا	مرتبہ: ڈاکٹر احمد حسین کمال
مقام دعوت	مولانا ابوالکلام آزاد
اسلام میں آزادی کا تصور (الحریت فی الاسلام)	مولانا ابوالکلام آزاد
طنزیاتِ آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد
ملفوظاتِ آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد

مکتبہ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 7232731
Email maktaba_jamal@email.com
maktabajamal@yahoo.co.uk